پچھلے پہر کی خاموشی
(افسانوی مجموعہ)
صائمہ نفیس
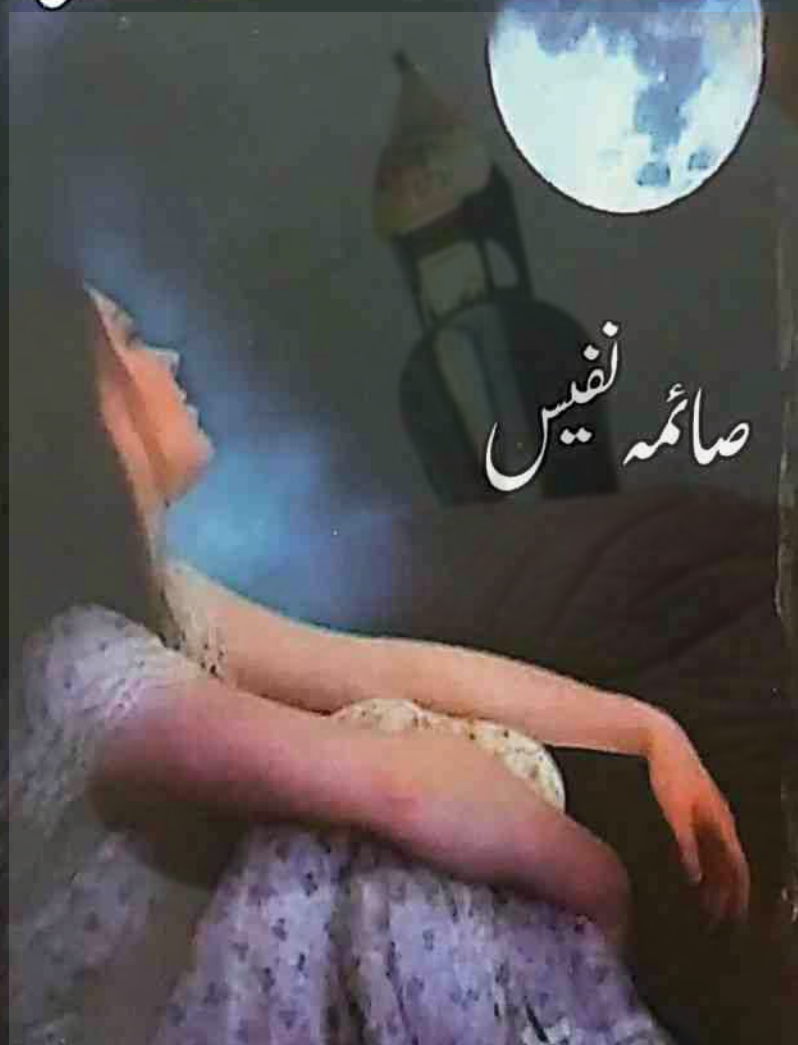
ہم زندگی میں رشتہ تو جلد بنا لیتے ہیں مگر انہیں تسلیم کرنے میں بہت وقت لگاتے ہیں اور کبھی کبھی تو تمام عمر ہی گزار دیتے ہیں رشتوں کو ان کے صحیح مقام نہیں دے پاتے"۔

(تین د)

''مرد شادی سے پہلے عورت کی جس خوبی سے متاثر ہوتا ہے شادی کے بعد سب سے پہلے اُسی پر روک لگا دیتا ہے''۔

(بلی)

''خدا کی تلاش کا سرا تمہارے اپنے اندر ہے سب سے پہلے اپنے آپ کو تلاش کرو''

(سپر سسٹم)

پھر تمہارے فراق لمحوں کا زہر میری شاعری پینے لگی اور سقراط کی مثال بن گئی۔ میرا محبت سے اعتبار ہی اُٹھ گیا اس خالی جگہ کو تنہائی پُر کرنے لگی۔ مگر اس تنہائی میں بھی شاعری نے مجھے تنہا نہیں رہنے دیا وہ آ کر میرے ساتھ رہنے لگی۔

(لفظوں کی ردا)

''واہ رے قانونی سسٹم کیسے دولت مندوں کے گناہ پر چادر ڈال دیتے ہیں لگتا ہے جیسے یہ سسٹم چھوڑے ہی اس لیے گئے ہیں کہ ان کے خریدار باؤ تاؤ کر سکیں''

(پچھلے پہر کی خاموشی)
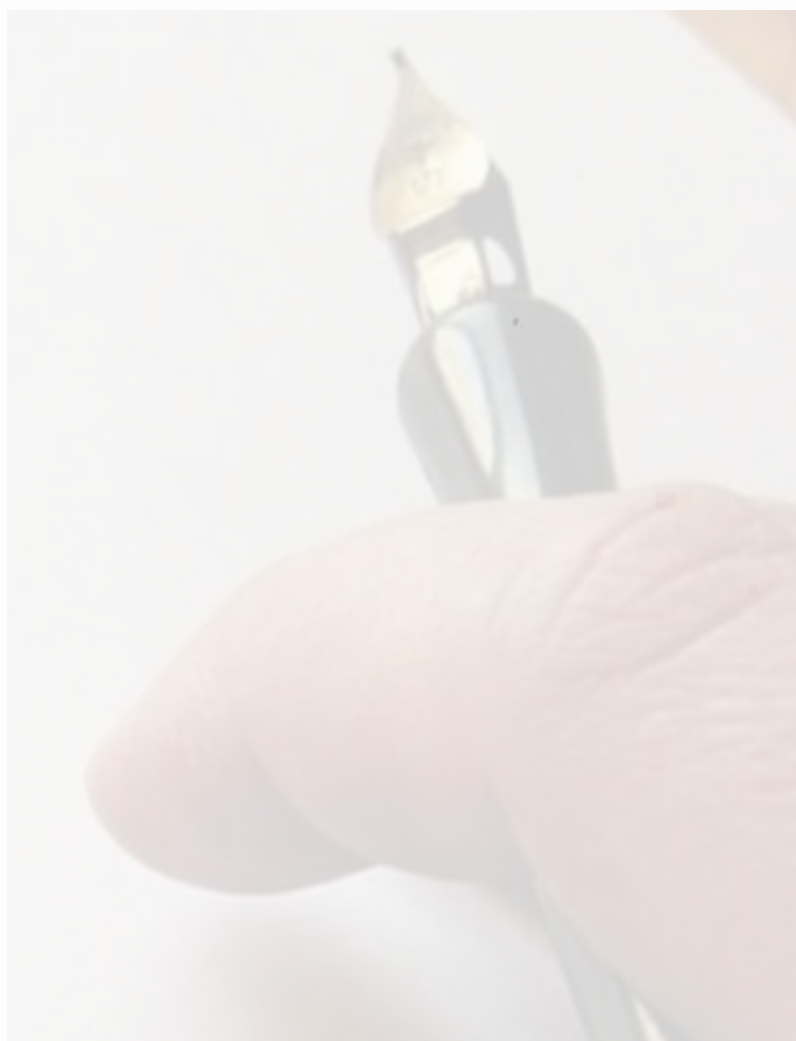
افسانے

پچھلے پہر کی خاموشی

مصنفہ: صائمہ نفیس

Naveed Square. Urdu Bazar. Karachi
Ph # 021-32762483
E-mail: citybookurdubazaar@gmail.com
City Book Point

باذوق لوگوں کے لیے خوب صورت معیاری کتاب

بیاد

HASSAN DEEN

ادارہ City Book Point کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ ہمارے ادارے کے پیش نظر صرف تحقیقی کتب کی اشاعت ہے۔

کتاب : پچھلے پہر کی خاموشی

مصنفہ : صائمہ نفیس

تعداد : 500

سن اشاعت : 2022ء

قیمت : 450 روپے

انتساب

اپنے بچوں
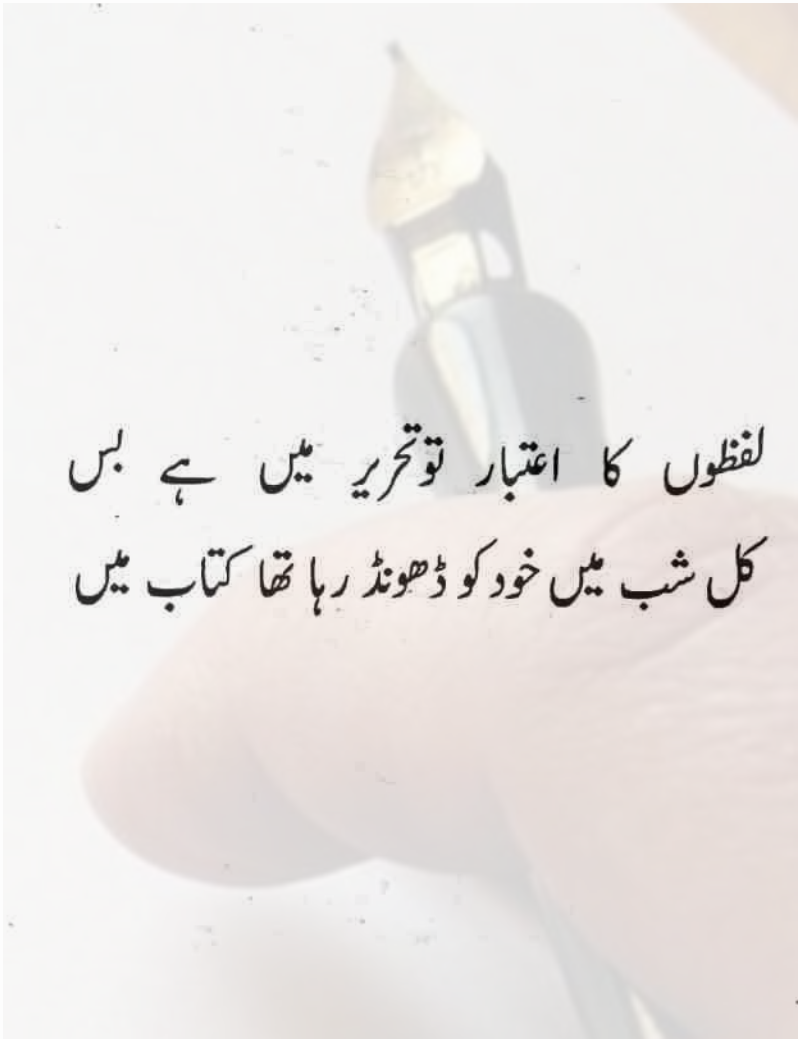
ڈاکٹر شہروز نفیس

ڈاکٹر فیضان نفیس

اور

شجیہ نفیس (ایم فل، فزکس)

کے نام

لفظوں کا اعتبار تو تحریر میں ہے بس
کل شب میں خود کو ڈھونڈ رہا تھا کتاب میں

ترتیب

افسانے

صائمہ نفیس کے موضوعات۔ مختلف اور منفرد

کہانیاں تو ہر لمحے آپ کے آس پاس گردش میں رہتی ہیں۔ چہرہ چہرہ بجی ہیں۔ درختوں کی ٹہنیوں پر پھوٹ رہی ہیں۔ گلی گلی کھڑکیوں منڈیروں سے جھانک رہی ہیں۔ فٹ پاتھ پر ابھرتے نقوش قدم میں لڑکھڑا رہی ہیں۔ ہم میں سی بہت سے آنکھ کان ناک بند کیے گزر جاتے ہیں۔ افسانہ نویس رک جاتا ہے۔ ان کہانیوں کو اپنی سانسوں میں کر لیتا ہے پھر کسی شبھ گھڑی یہ ایک تخلیقی تحریر بن کر قلم سے کاغذ پر اتر آتی ہیں۔ اور ادب کی دنیا میں دھوم مچا دیتی ہیں۔

کہانی۔ افسانہ۔ Short Story ہر صاحب مطالعہ کی پسندیدہ صنف رہی ہے۔ بلکہ کمزوری بھی۔ جب حقیقتیں تلخ ہو جاتی ہیں۔ ایک حساس طبع حقائق کے سامنے عجز کا شکار ہو جاتی ہے۔ تو اسے پناہ اور راحت افسانے میں ہی ملتی ہے۔ چاہے افسانہ پڑھ کر۔ چاہے لکھ کر۔

کووڈ 19 کی عالمگیر وبا اور ملکوں ملکوں لاک ڈاؤن کی اذیت ناک حقیقت میں افسانے نے ہی تنہائی بانٹی ہے۔ آپ بھی یقیناً اس بے کلی سے گزرے ہوں گے۔ میں تو اپنی کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے افسانوی مجموعے دوبارہ پڑھے۔ الماریوں میں گرد میں اٹے افسانوی کتابیں خود آواز دیتی رہیں۔ یہ اعلیٰ ادبیات مایوسیوں۔

المیوں سے بہت دور لے جاتی رہی ہیں۔ افسانے کی خوبی یہی ہے کہ یہ ایک بالکل الگ۔ مختلف دنیا کچھ دیر کے لیے بسا دیتا ہے۔ پڑھنے والا ان کرداروں میں گھر کر اپنے آپ کو۔ اپنے گرد و پیش کو بھول جاتا ہے۔ ایک اچھے افسانے کی خوبی بھی یہی ہے کہ وہ آپ کو چند لمحوں کے لیے اپنی پوری گرفت میں لے لے۔

'پچھلے پہر کی خاموشی' کی کہانی کار صائمہ نفیس کی لطافت۔ ریاضت اور نفاست تو ان

کی آنکھوں میں جھلکتی حیرت بھری اپنائیت۔ اور زیرِ لب مسکراہٹ سے ہی مدّ مقابل پر غلبہ پاتی رہتی ہے۔ مگر جب اس مجموعے کی کہانیوں کے گلی کوچوں میں گھومنے۔ فارم ہاؤسوں میں جھانکنے۔ کچے گھروں کی مٹی سونگھنے۔ جیتے جاگتے کرداوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ تو صائمہ نفیس کی حساسیت سے بھی آگاہی ہوئی۔ ان کی ہستی بہت درد مند، بے کسوں کے سر پر ہاتھ رکھنے والی، ماؤں بہنوں کے سر سے اترتی چادر واپس احترام سے سر پر رکھنے والی محسوس ہوئی۔

افسانہ پڑھنے میں کتنا آسان۔ لکھنے میں بہت مشکل ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کو بہت سے کٹھن مراحل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو کہانی کے رقبے کو نشان زد کرنا۔ پھر اس کی تکنیک کے زیر و بم کو سنبھالنا۔ کرداروں کو گرفت میں رکھنا۔ بہت حوصلے کا متقاضی ہے۔

افسانہ عالمی سطح پر Short Story کہلاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے فکر۔ تصور تراشی بہت طویل ہوتی ہے۔ اس دراز فکری کے بعد کہانی کے فن کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کا دائرہ جتنا محدود ہو۔ عرصہ جتنا قلیل ہو۔ کہانی اتنی ہی موثر اور دلچسپ ہو جاتی ہے۔ موضوعات تو آپ کو اپنے پڑوس میں بلکہ اپنے گھر میں ہی فراوانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے۔ اس کے بعد کڑے مراحل آتے ہیں کہانی کی بنت کے۔ بالکل ایک سوئٹر کی بُنائی کی طرح۔ اب تو سلے سلائے بنے بنائے سوئٹر۔ جرسیاں۔ صدریاں مل جاتی ہیں۔ اس لیے پیاسی آنکھیں سلائیوں کو اوپر نیچے کرتی حسین انگلیوں کو ترستی رہتی ہیں۔

افسانہ نویسی میں ترقی پسندوں نے زیادہ غلبہ حاصل کیا۔ کیونکہ وہ افسانے کو حقیقت کے قریب تر لانے میں سرگرم رہے۔ ان زندگیوں، کرداروں اور واقعات کو اپنا موضوع بنایا۔ جنہیں عام کہانی کار شہرِ ممنوعہ خیال کرتے تھے۔ اس طرح کہانی شاہی محلات، رجواڑوں، حویلیوں سے باہر نکل سکی۔ دیہات، قصبوں اور بڑے شہروں کی کچی آبادیوں میں گزرنے والا اکثریتی جیون لکھنے والوں کا موضوع بنا۔

صائمہ نفیس کی کہانی بھی اکثریت کو درپیش الجھنوں، پریشانیوں اور تفکرات کو اپنا محور بناتی ہے۔ وہ اپنے کردار پُرتعیش آبادیوں کے اونچے بنگلوں، جاگیرداروں کی حویلیوں، جنرلوں کے قلعوں، گلبرگوں، ڈیفنسوں کی بیگمات میں نہیں ڈھونڈتیں۔ آسودہ حالی ان کے لیے کشش نہیں رکھتی۔ وہ بدحالوں کا درد جاننا چاہتی ہیں۔ ان کو کہانی کا پیرہن پہنا کر زمانے کے سامنے لے آتی ہیں۔ اب اس کے بعد زمانے پر منحصر ہے کہ وہ ان الجھنوں کو دور کرے یا وہ بھی اپنے آپ کو ان

کے رنگ میں رنگ لے۔

موضوعات کا چناؤ بہت ہی فکرمندی سے کیا جاتا ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو'عورت اور آئینہ'، 'حمام'، 'سپر سسٹم'، 'ٹھنڈا بوسہ'، میں ایک سفاک مورخ کی طرح بیان کرتی ہیں۔ 'پانچویں بوتل' بہت ہی مہارت سے بنی ہوئی کہانی ہے۔ 'دسمبر کا سندیسہ' تخیل اور انشا پردازی کا مظہر ہے۔ 'سپر سسٹم'، صرف اپنے ملک کی نہیں پوری دنیا میں رائج ناانصافیوں کی داستان ہے۔ آج کے معاشرے میں عام لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے والے سرکاری غیر سرکاری نیٹ ورک کو ویسے تو ہر افسانے میں بے نقاب کرتی ہیں مگر 'کڑیاں' میں یہ مہارت اپنے عروج پر ہے۔ تجاوزات، اسیری، تین د، بلی، ہمارے استحصالی معاشرے کی دل خراش تصویریں ہیں۔ وہ پرانے رسم ورواج کی تاریکیوں سے، ہی نہیں جدید دَور کی معاشرتی پیچیدگیوں سے بھی خبردار کرتی ہیں۔

میں صائمہ نفیس کو ان مختلف اور منفرد کہانیوں پر مبارکباد بھی دینا چاہوں گا اور امید کرتا ہوں کہ اُردو ادب میں 'پچھلے پہر کی خاموشی' ایک خوشگوار اضافہ ہوگا۔ بہت سے کردار شہروں اور گاؤں میں صائمہ نفیس کی دیدۂ بینا کے انتظار میں ہیں۔

محمود شام

خاموشی اوراحتجاج

پاکستان سے گزشتہ دس برسوں میں جن خواتین افسانہ نگاروں نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ان میں ایک نام صائمہ نفیس کا بھی ہے۔صائمہ نفیس اپنے افسانوں کے موضوعات کا انتخاب کچھ اس طور کرتی ہیں کہ قاری حیرت میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ان کے متعدد افسانے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔کئی افسانے تو چونکاتے ہیں،اور ختم ہونے کے بعد قاری کے اندر شروع ہو جاتے ہیں۔

صائمہ نفیس کا پہلا مجموعہ''رودالی'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں تقریباً ڈیڑھ درجن افسانے شامل تھے۔افسانہ''رودالی'' کافی مشہور ہوا اور صائمہ نفیس کی شناخت بن گیا۔اب ان کا دوسرا مجموعہ''پچھلے پہر کی خاموشی'' شائع ہو رہا ہے۔اس مجموعہ میں انیس افسانے شامل ہیں۔ان افسانوں میں ایک طرح کی خاموشی اوراحتجاج شامل ہے۔خواہ وہ افسانہ''پچھلے پہر کی خاموشی'' ہو یا''لفظوں کی ردا''،''پانچویں بوتل'' ہو یا''اسیری''۔

''پچھلے پہر کی خاموشی'' نہ صرف مجموعہ کا ٹائٹل افسانہ ہے بلکہ ایک بہترین افسانہ بھی ہے۔اس افسانے کے آخر میں جو خاموشی چھا جاتی ہے وہ ظلم کے خلاف ایک خاموش احتجاج ہی ہے۔مجھے امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس مجموعہ کو بھی سراہا جائے گا اور صائمہ نفیس کی شناخت مزید مستحکم ہوگی۔

پروفیسر اسلم جمشید پور

صدر شعبۂ اردو

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

9456259850

اردو افسانے کا اعتبار صائمہ نفیس

مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ اُردو افسانہ اس وقت کہاں کھڑا ہے تو میرا فوری جواب یہی ہو گا کہ اعتبار اور بے اعتباری کے درمیان ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو افسانے پر ایسی افتاد اور بے اعتباری کا دور پہلے کبھی نہیں آیا تھا جس سے اُردو افسانہ موجودہ عہد میں گزر رہا ہے۔اس تمثیل سے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میرا، بلکہ یہ کہئے کہ سنجیدہ فکشن پڑھنے والے قارئین کا اُردو افسانہ سے اعتبار ہی اُٹھ گیا ہے اور آیا کہ یہ کبھی دوبارہ اُس اُوج پر پہنچ سکے گا جیسے اس صنف کو پچھلی نصف صدی کے ادیب چھوڑ گئے تھے۔

اشفاق احمد، انتظار حسین، ممتاز مفتی، بیدی ، کرشن چندر، پریم چند، احمد ندیم قاسمی، منٹو، رام لعل، دیکھتے ہی دیکھتے افسانے کے یہ عظیم نام تہہ خاک ہوئے اور پھر اس خاک سے ایسے نام ابھر کر سامنے نہیں آئے جنھیں ان کے مقابل رکھا یا جانشین سمجھا جا سکے، بعینہٖ اُردو شاعری کا بھی یہی حال ہوا، احمد فراز اور منیر نیازی کے جاتے ہی غزل گو شاعری کا سلسلہ رک گیا۔ان دو اصناف کو سب سے زیادہ نقصان سوشل میڈیا نے پہنچایا، آپ ہاتھ کے ہاتھ چار لائنیں لکھیں، سوشل میڈیا پر پھینکیں، اگر آپ مرد شاعر ہیں تو واہ واہ کی داد سمیٹیں اور اگر خاتون شاعر ہیں اور آپ نے کسی اچھے اسٹوڈیو سے اپنی فوٹو بھی بنوا رکھی ہے تو پھر واہ واہ کے ساتھ آہ آہ کے کمنٹ کے ساتھ ہر وزن اور بے وزن شعر اور ہر بے ربط و بے اثر افسانے پر تحسین کے کلمات سمیٹیں اور اپنے حلقے میں ثقہ شاعر یا افسانہ نگار بن جائیں ۔اس رویے نے سنجیدہ لکھنے والوں کو بے حد نقصان پہنچایا ۔رہی سہی کسر افسانچے اور مائیکرو فکشن نے نکال دی۔ یوں افسانے کا سنجیدہ قاری اُردو افسانے کے مستقبل سے مایوس دکھائی دیتا ہے۔کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کیا میں یا میری اگلی نسل اشفاق

احمد، انتظار حسین، بیدی، منٹو یا ممتاز مفتی کے نعم البدل افسانہ نگاروں کو پڑھ پائے گی اور کیا اُردو ان جیسے کہانی کاروں کا بدل دریافت کر پائے گی تو میں بھی بے اعتباری کی کیفیت میں چلا جاتا ہوں۔

مجھے جب صائمہ نفیس کے افسانوں کا مجموعہ ''پچھلے پہر کی خاموشی'' کا مسودہ پڑھنے کے لئے دستیاب ہوا اور میں نے ان کہانیوں کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اُردو افسانے کا جو اعتبار ہے وہ صائمہ نفیس جیسے لکھاریوں پر قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہ اُردو افسانہ لکھنے والوں کی وہ نئی کھیپ ہے جو روایت سے جڑے رہ کر اپنے عہد کے مسائل پر بات کرتی ہے، نئی کہانیاں تلاش کرتی ہے۔ افسانہ خواہ کتنا بھی جدید روپ کیوں نہ دھار لے اس کا بہرحال روایت سے جڑا ہونا ضروری ہے تا کہ افسانہ پڑھنے والے کو نئے افسانہ میں رفتگان کی ہمراہی کا احساس بھی رہے، شاعری میں بھی نئے رجحانات اور تجربات کئے گئے اور آج کی نوجوان نسل نے، جن کا تمام تر دارومدار سوشل میڈیا کی داد پر ہے شاعری کو بھی جینز ٹی شرٹ پہنانے کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ لیکن غزل آج بھی وہی کہلائی جائے گی جو میر و غالب نے کہی اور بعد ازاں جسے فیض، فراز، ناصر کاظمی، عدم، ساحر، مجید امجد، منیر نیازی اور اسی قبیل کے شعراء نے آگے بڑھایا۔

میں نے ''پچھلے پہر کی خاموشی'' کا مطالعہ کا آغاز جس افسانے سے کیا وہ ''تین ڈ'' تھا۔ جس نے مجھے یہ بتا دیا کہ لکھنے والی کا فکری رجحان اور اسلوب کیا ہے اور وہ کیوں کر مجھے افسانے کے اعتبار کی طرف دھکیل رہی ہے۔ یہ روایت سے جڑا ہوا ایک جدید افسانہ ہے جسے اگر ڈرون سے دیکھا جائے تو اس افسانے کی تین چار جہتیں نظر آئیں گی اور کمال کی بات یہ ہے کہ مصنفہ نے ان تمام جہات پر ایسی کڑی نظر رکھی ہے کہ افسانے کے انجام تک تمام راستے ایک چونکا دینے والے روپ میں ایک چوک میں آن ملتے ہیں۔ میں افسانوں یا شاعری کی کسی کتاب پر تبصرہ کے لئے کبھی کسی افسانے کی روح یا جوہر پیش نہیں کرتا یہ قارئین کا کام ہے کہ وہ کسی تخلیق سے کیا اخذ کرتے ہیں۔ آپ جب یہ افسانہ پڑھیں گے تو اس میں اس قدر رنگ ہیں کہ ہر پڑھنے والے پر یہ مختلف تاثر چھوڑے گا۔

افسانے کی تخلیق میں میرے نزدیک دو عناصر اہم ہیں ایک تو کہانی میں فکر اور جذبے کی انوالمنٹ اور دوسرا عنصر مٹی کا رچاؤ ہے۔ آپ ''پچھلے پہر کی خاموشی'' کی کہانیوں کو دنیا کے کسی کونے میں بیٹھ کر پڑھیں، اس پر کسی مرد یا خاتون کا نام نہ لکھیں، کوئی رنگین تصویر چسپاں نہ کریں

۔آپ کو ان میں لکھنے والے کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیں گی اور کراچی، لاہور کی مٹی ہی کی بو آئے گی۔ان افسانوں میں ہمارے اردگرد رہنے والے کرداروں کی مدد سے روزمرہ کے مسائل ہی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اگرچہ کہ اپنے اسلوب سے ہٹ کر بات کہنا کہانی کار کے لئے مشکل امر ہے کہ اسلوب فطری ودیعت ہے پھر بھی افسانے کی تخلیق میں بنیادی کردار ابلاغ کا ہے،آپ افسانہ قاری کے لئے لکھتے ہیں نہ کہ اپنی تسلی کے لئے لکھ لکھ کر اپنی ڈائری میں جمع کرتے ہیں۔ان افسانوں کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ ان میں براہ راست بات کی گئی ہے علامتیں اور استعارے اگر کہیں برتے گئے ہیں تو سہل اور دلکش انداز میں برتے گئے ہیں۔

میں نے ان افسانوں پر لکھنے کے لیے انہیں ایک ہی نشست میں نہیں پڑھا بلکہ ہر افسانے کو وقت دیا ہے کہ افسانہ نگار نے اس کہانی میں، جو میں نے ابھی پڑھی ہے کیا کہنا چاہا ہے اور وہ کس حد تک اس میں کامیاب ہوا ہے۔میں نے ان افسانوں کو ایک ناقد کی آنکھ سے بھی نہیں دیکھا، بلکہ انہیں یوں پڑھا ہے جیسے احمد، عبداللہ، کاشف یا مریم اور فاطمہ انہیں پڑھیں گے۔ اس صورت میں ان افسانوں نے مجھے دہرا لطف دیا۔ان افسانوں کو آپ بھی اسی طرح پڑھیے گا، آزاد ماحول میں رُک رُک کر، ہر کہانی کا الگ لطف لیں۔

میں جو ان افسانوں پر کچھ لکھنے بیٹھا ہوں تو اس وقت میرا ذہن بالکل آزاد ہے، میں نہیں جانتا صائمہ نفیس کون ہیں، یہ کب سے افسانے لکھ رہی ہیں اور ان کی دیگر ادبی سرگرمیاں کیا ہیں۔،اگر میں ان کی شخصیت کے تمام پہلو مدنظر رکھ کر کچھ لکھوں گا تو اس مضمون کا رنگ تنجن کی طرح ست رنگی ہو جائے گا جبکہ مجھے ان کی ادبی خدمات جانتے ہوئے بھی خالصتاً ان کے افسانوں کے جوہر پر بات کرنی ہے اور یہ جاننا ہے کہ اُن کا فکری رجحان کیا ہے۔وہ کس زاویہ سے سماج کو دیکھ رہی ہیں، اُن کے دکھ کیا ہیں۔کہانی کار کا دکھ، کہانی کار کا نہیں ہوتا یہ اس کے سماج کے چلتے پھرتے آدمی کا دکھ ہوتا ہے۔کہانی کار اس دکھ کو صرف محسوس کرتا ہے اور اگر وہ اس دکھ کو ہو بہو لفظوں میں ڈھالنے کا فن رکھتا ہے تو وہ ایک افسانہ نگار ہے اس حوالے سے مجھے بے حد اطمینان ہوا کہ جن افسانوں پر میں اپنی رائے کا اظہار کر رہا ہوں ان کا کہانی کار ان دکھوں کی کاربن کاپی کر رہا ہے، جو وہ دیکھ رہا ہے اس وقت یہی میرا منصب ہے۔

کہانی کار اگر دیہاتی زندگی سے وابستہ ہے تو اسے بڑی سہولت ہے کہ وہ کریسے، فیتے

یا مائی جیراں پر زمین یا فصلوں کے مسائل یا تنازعات پر چند کہانیاں لکھ کر سکون کی نیند لے، مسئلہ یہ ہے کہ صائمہ نفیس پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں بیٹھی ہیں یہاں پاکستان کے ہر خطے کے لوگ اپنی اپنی مسرتوں، شادمانیوں، دکھوں اور مصائب کے ساتھ آباد ہیں اس لحاظ سے کہانی کار کا مشاہدہ اہمیت کا حامل ہے۔ان کہانیوں کی یہی خصوصیت ہے کہ ان کے مضامین اسی پیچیدہ شہر کا احاطہ کرتے ہیں۔اور ہر کہانی ایک مکمل مشاہدہ بیان کرتی ہے ان افسانوں میں زبان کا حسن ان کی سب سے بڑی خوبی ہے یہ ایک پختہ کہانی کار کی زبان ہے جو افسانوی زبان سے واقف ہے۔ان افسانوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ صائمہ نفیس نے کراچی جیسے بڑے شہر میں اپنا تخلیقی سفر پروان چڑھایا ظاہر ہے اُن کی الٹرا ماڈرن یا لبرل حلقوں تک رسائی بھی رہی ہوگی، لیکن انہوں نے اپنی کہانیوں کا الگ جہاں آباد کیا اُن کے افسانوں میں جو عورت دکھائی دیتی ہے وہ اگرچہ تنگی حالات کی دہائی دیتی ہے لیکن وہ لٹھ لے کر مرد پر چڑھ نہیں دوڑتی بلکہ اس کے ساتھ مل کر تفہیم کی راہ نکالتی ہے۔ان کے نصف سے زائد افسانوں کا مرکزی کردار یہی عورت اور مرد کے تعلق ہے جہاں مرد کو عورت پر اہمیت دی گئی ہے لیکن عورت کی زبان سے مرد کے لئے تحقیر آمیز رویے یا مکالمے سے گریز کیا ہے ان کا یہی پہلو ان کے افسانوں کو روایت سے ملاتا ہے اور ان کی ذہنی تازگی وذرخیزی کی اطلاع دیتا ہے۔صائمہ نفیس مہذب ہے اور وہ اپنی عورت کو اسی روپ میں دیکھنا چاہتی ہے۔

صائمہ نفیس کی فکر کا مرکز عورت اور اس کے مسائل ہیں یہ عورت کچی آبادیوں کی مکین بھی ہے اور بنگلے کوٹھیوں کی پر آسائش زندگی گزارنے والی بھی، البتہ وہ بیشتر نچلے طبقے کی عورت کی نمائندہ ہیں۔اس ضمن میں اُن کے افسانے ''بکلی'' کی ''میرا'' اور ''آئینہ اور عورت'' کی ''رانی'' کے کردار کی مثال دی جا سکتی ہے۔ان کرداروں کے دکھ گویا افسانہ نگار کے اپنے دکھ ہیں اور وہ ان کرداروں کے ساتھ رہ کر یہ کہانی لکھ رہی ہیں۔

''اسیری'' صائمہ نفیس کا ایسا افسانہ ہے جس میں عورت کی نفسیات کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا گیا ہے اور اسے بڑی خوبصورتی سے کہانی کا روپ دیا گیا ہے۔آپ جب یہ کہانی پڑھیں گے تو آپ پر کھلے گا کہ کہانی کار نے کس سہولت کے ساتھ عورت کی نفسیات کی نمائندگی کی ہے۔اسی طرح ان کے افسانے ''پچھلے پہر کی خاموشی''، ''تبدیلی''، ''گروی رکھی آنکھیں'' اپنی طرز کے منفرد افسانے ہیں جبکہ ''پانچویں بوتل'' میں آپ کو ایک بالکل منفرد افسانہ پڑھنے کو ملے گا جس کا

انجام پڑھ کر آپ پر گہری خاموشی چھا جائے گی۔

افسانہ اور شاعری کے حوالے سے ہمیشہ دو طبقے میرے پیش نظر رہے ہیں ایک تخلیق کار اور دوسرا قاری

جس کے ہجراں میں کتابوں پہ کتابیں لکھ دیں
اس پہ گر حال ہمارا نہیں کھلتا ، نہ کھلے

پڑھنے والے پر اگر تخلیق کار کے دل کا حال نہیں کھلتا یا اس کی تخلیق کا ابلاغ نہیں ہوتا تو پھر چاہے لکھنے والا کتابوں پر کتابیں لکھ دے بات نہیں بنے گی۔اسی لئے میں کسی تخلیق کو قاری کے تناظر میں بھی دیکھتا ہوں۔

پچھلے پہر کی خاموشی'' کی تخلیق کار صائمہ نفیس نے جو افسانے تخلیق کئے ہیں ان میں ابلاغ اور دل کا حال بہت واضح ہے اس لئے ان کا ابلاغ انتہائی سہل ہے، اسلوب گنجلک نہیں بیان سادہ ہے یہی وجہ ہے کہ یہ افسانے پڑھت کے ساتھ ساتھ دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

یہ تو تھا افسانہ نگار کا کمالِ فن، اب رہی قاری کی بات تو کوئی بھی تخلیق، وہ افسانہ ہو یا شعر اپنا قاری خود تلاش کرتی ہے۔یہ افسانے بھی ادبی حلقوں میں جہاں بھی جائیں گے اپنا قاری خود تلاش کر لیں گے اور اس کے لئے کتابوں پر کتابیں لکھنے کی نوبت بھی نہیں آئے گی۔عورت جس کے دکھ اور ہجراں میں یہ افسانے لکھے گئے ہیں۔''پچھلے پہر کی خاموشی'' کے قاری پر صائمہ نفیس کے دل کا حال اُن کے اسی افسانوی مجموعہ میں ضرور کھلے گا۔

مجھے یقین ہے کہ یہ افسانوی مجموعہ اُردو کے ادبی حلقوں میں نہ صرف نئے لکھنے والوں سے دادو تحسین لے گا بلکہ کلاسک اَدب پڑھنے والے مجھ سے بزرگان سے بھی تحسین پائے گا۔

منیر فراز

۳۰ ستمبر ۲۰۲۱ء

''پچھلے پہر کی خاموشی''

مردہ سماج کا زندہ بیانیہ

کہانی کہنے اور کہانی سننے کا مشغلہ تو ابتدا ہی سے ہر انسان کی فطرت میں شامل رہا ہے لیکن کہانی لکھنا صرف اُسی انسان کا کام ہے جس کی قوتِ متخیلہ عمدہ ، مشاہدہ تیز اور قلم رواں ہو ۔زندگی خود ایک ایسی کہانی ہے جو اپنے اندر ''الف لیلہ''، ''بیتال پچیسی'' اور ''سنگھاسن بتیسی'' کی طرح فکر کو مہمیز کرتی، ہنستی مسکراتی اور روتی بلبلاتی کہانیوں کا خزانہ سمیٹے ہوئے ہے بس تخلیق کار کی نظر کونوں کھدروں میں جھانکنے کا جو ہنر رکھتی ہے وہی اسے کہانی کار بناتی ہے۔صائمہ نفیس سے آپ ملیں گے تو ایک خوش باش ہنستا مسکراتا دلکش وجود آپ کا استقبال کرے گا لیکن صائمہ نفیس کی کہانیاں پڑھتے ہوئے ایسا لگے گا کہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے کرداروں کو ڈھونڈ کر اُن سے دوستی کر کے اُن کے دکھوں کو سمیٹنا اور اور پھر ان دکھوں کو لفظوں کی ناؤ بنا کر سمندر میں بہا دینا اُن کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔

صائمہ نفیس کا پہلا مجموعہ ''رودالی'' ۲۰۰۶ء میں آیا جس میں بیش تر کہانیوں کے مرکزی خیال عورت کی زندگی کے گرد گھومتے ہیں۔پدرسری سماج عورت کو ایک مکمل انسان تسلیم کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہا ہے۔عورت کے تخلیقی اظہار کو بھی تاریخ اَدب اور تنقیدِ ادب میں وہ جگہ نہیں دی گئی جس کی وہ حق دار ہے لیکن ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب تاریخ کے فریب کا پردہ چاک ہوتا ہے لہٰذا آج صرف عالمی اَدب ہی میں نہیں بلکہ اُردو ادب میں بھی نسائی اظہار کی مختلف جہتوں پر بات ہو رہی ہے۔شاعری اور فکشن دونوں میں عورت نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ تخلیقی اظہار کی

بھرپور صلاحیت رکھتی ہے اور اپنی صنف کے احساسات، جذبات اور خیالات کے ساتھ زندگی کے حوالے سے اپنا فکری بیانیہ بھی تشکیل دے سکتی ہے۔ اُردو میں محض افسانے کی صنف میں ہی اگر خواتین کے نام گنوائے جائیں تو ایک خوب صورت کہکشاں سی پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کہکشاں سے پھوٹنے والی روشنی کو کئی جہتوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور وقت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ نئے لکھنے والے سامنے آئیں اور مسلسل ریاضت سے فنی پختگی کی منزل کی طرف بڑھیں۔ بہر حال صائمہ نفیس کی کہانیوں پر جگہ جگہ آنسوؤں کے جو دھبّے ہیں وہ بھی عورت کی آنکھوں سے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کے نشانات ہیں لیکن انھیں پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ فیمینزم کے بعض مغربی رویوں سے متاثر کوئی فیشن زدہ خاتون نہیں ہیں بلکہ وہ تو اپنے دیس میں رواج پانے والی اُن رسموں، ریتوں اور فرسودہ رویّوں کے خلاف ایک مزاحمتی فکر رکھتی ہیں جن کی وجہ سے شہر اور دیہات میں رہنے والی اکثر خواتین مسلسل ایک ذہنی اذیت سے گزرتی رہتی ہیں۔ اب جب اُن کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''پچھلے پہر کی خاموشی'' مکمل ہو کر اشاعت کا منتظر ہے تو اس میں بھی ان کہانیوں کی تخلیق کار اپنی کئی کہانیوں میں آج کی عورت کے لیے اُس عزت، محبت اور ذہنی آسودگی کی متلاشی نظر آتی ہے جس کا ہمارے معاشرے میں فقدان ہے مثلاً ''تین د'' ایک بہت اچھی کہانی ہے۔ سماج کے حصار میں قید مگر اپنے ماضی کے خوف سے آزادی حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والی ایک عورت کی کہانی جسے واحد متکلم کا صیغہ اختیار کرتے ہوئے نفسیاتی تناظر میں لکھا گیا ہے۔

اسی طرح ''محبوبہ'' کے عنوان سے اس مجموعے میں شامل کہانی کی ہیروئن 'سویرا' جب اپنے شوہر کی بے وفائی کے بعد یہ سوچتی ہے کہ ''کاش نانی نے اسے روایتی وفا شعار بیوی بننے کے بجائے محبوبہ بننے کا سبق دیا ہوتا'' تو دراصل تربیت اور عملی زندگی کے درمیان ایک خلا کو ظاہر کرتی ہے۔ میرا، جو ایک اور کہانی ''نکی'' کا مرکزی کردار ہے، یہ سوچنے میں حق بجانب ہے کہ ماں کا دکھایا ہوا راستا بھی زندگی کی سنگلاخ حقیقتوں کو عبور کرنے کا حوصلہ عطا نہیں کرسکتا کیوں کہ سچ یہی ہے کہ ''عورت موم بنے یا لوہا عورت کے مقدر میں نارسائی کا دکھ ہے''۔ ''عورت اور آئینہ'' بھی اگرچہ ''محبوبہ'' اور ''نکی'' کی طرح ایک روایتی موضوع پر ہی لکھا گیا ہے لیکن اس کا ٹریٹمنٹ ذرا مختلف ہے۔ اس کا کردار 'رانی' لوئر مڈل کلاس کے نہ جانے کتنے گھروں کا کردار ہے جسے گھر سے رخصت کرتے وقت کہا جاتا ہے کہ سسرال ہی تمھارا اصل گھر ہے لیکن کبھی کبھی شوہر کے ساتھ ساتھ

جوان اولاد کی بے وقعتی کا دکھ بھی عورت کو سہنا پڑتا ہے اور وہ ساری عمر کبھی اپنا اصل گھر تلاش کرتی ہے اور کبھی اپنا وجود۔ ''لفظوں کی ردا'' ایک مقبول شاعرہ کی زندگی کے نشیب وفراز کا احوال بیان کرتی ہے ، ٹھنڈا بوسہ'' ضرورت اور مفادات کے دائرے میں چکر کاٹنے والے اس خود غرض معاشرے کی جھلک دکھلاتی ہے اور ''اسیری'' محبت کے جذبے کی سچائی کو ضبطِ تحریر میں لاتی ہے جس کے لیے وقت اور عمر کی قید کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس طرح یہ افسانے نسائی طرزِ اظہار کے آئینہ دار ہیں لیکن موضوعاتی سطح پر صائمہ نفیس کے اس دوسرے مجموعے سے اُن کے ذہنی ارتقا کا اندازہ بھی ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے میں متنوع موضوعات نظر آتے ہیں۔ صائمہ نفیس ادبی صحافت سے بھی وابستہ ہیں، ریڈیو پاکستان کراچی سے ایک پروگرام ''ادب سرائے'' میں میزبانی کا فریضہ بھی انجام دیتی ہیں اور ایک باشعور خاتون کی طرح گھر اور باہر کی ذمّے داریاں بھی بخوبی نبھاتی ہیں ، قوتِ مشاہدہ تیز ہے اور بیدار ذہن کی مالک ہیں اس لیے اُن کی نظر معاشرے کے دیگر مسائل پر بھی ہے مثلاً غربت اور بھوک اس عہد کا ایک بڑا المیہ ہے۔ ''دروازہ'' ، ''حمام'' اور ''پانچویں بوتل'' جیسے افسانے اسی مسئلے کو اجاگر کرتے ہیں۔ خاص طور پر ''حمام'' تھر کے صحراؤں میں پھیلی ہوئی تشنگی اور انگڑائیاں لیتی ہوئی بھوک کے موضوع پر بہت اچھا افسانہ ہے۔ بابا نورالدین کا کردار اس میں اہم ہے جو موروں کے خوب صورت پر نکالتا رہتا ہے اور پھر انھیں دفن کرتا رہتا ہے تاکہ وہ مردار خور جانوروں کی خوراک نہ بنیں لیکن بھوک اور افلاس جب انسانوں کو بھی گِدھ میں تبدیل کر دیں تو اس کا علاج کسی کے پاس نہیں۔

وطنِ عزیز کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال کے تناظر میں کچھ افسانے بہت اچھے ہیں۔ کرپشن ہمارے سماج میں کینسر کی طرح پھیل چکا ہے اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اب یہ مرض لا علاج ہے۔ ''کڑیاں'' نامی افسانے میں اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ جس طرح زنجیر کی کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہوتی ہیں اسی طرح کرپشن بھی کسی فردِ واحد یا چند لوگوں پر مشتمل گروہ کا مسئلہ نہیں بلکہ اوپر کی سطح سے لے کر نچلی سطح تک کے کردار اس میں کسی نہ کسی طرح شامل ہیں۔ سادگی اور قناعت پسندی کی عادت کو ترک کرنے کا نتیجہ ہے کہ یہ ہمارے قومی مزاج کا حصہ بن چکی ہے ۔ ''تبدیلی'' کے عنوان سے ایک کہانی نہ صرف بھٹہ مزدوروں کی نسل در نسل غلامی کا المیہ بیان کرتی ہے بلکہ اس کے عنوان پر غور کیا جائے تو پاکستان کے موجودہ سیاسی منظرنامے کے حوالے سے اس میں زیریں لہر کے طور پر ہلکے سے طنز کی آمیزش بھی نظر آتی ہے۔ ''گروی رکھی

آنکھیں''' بھی اسی تناظر میں لکھا گیا ہے۔اس افسانے کا اسلوب واقعاتی نہیں ،اس میں کوئی مرکزی کردار بھی نہیں بس ایک خیال گردش کر رہا ہے جو موجودہ سیاست کے حوالے سے عوام کی سوچ کا مظہر ہے اگر چہ اس میں کسی حد تک لکھنے والے کے سیاسی خیالات بھی جھلک رہے ہیں جن سے جانب داری کا تاثر ابھرتا ہے۔

''سپر سسٹم'' کے عنوان سے ایک افسانہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے تضادات کو ظاہر کرتے ہوئے قاری کو بہت تکلیف دہ اور اذیت ناک کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔''دروازہ'' ایک مزدور کا قصہ ہے جو یہ بتاتا ہے کہ غربت کے مارے ہوئے پس ماندہ معاشروں میں، جہاں تجارت اور ترقی کے نام پر نہ جانے کتنے لوگوں کے لیے روزگار کے دروازے بند ہوتے ہیں وہیں بھوک اور ضرورت رشید جیسے کرداروں کو مشکل وقت میں روزگار کے لیے کوئی نیا دروازہ کھولنے پر آمادہ کرتی ہے خواہ اس کی بنیاد جھوٹ اور جعل سازی پر ہی کیوں نہ ہو۔''پچھلے پہر کی خاموشی'' بھی اپنے عصر سے جڑا ہوا ایک اچھا افسانہ ہے اور یہ اس مجموعے کا عنوان بھی ہے۔اس کہانی کا مرکزی خیال ہمارے بوسیدہ نظامِ انصاف کے گرد گھومتا ہے جس میں طاقت ور کو سزا ملنا کارِ محال ہے ۔گاؤں کی زمین کا برباد ہو جانا، کنوؤں کے پانی میں کڑواہٹ کا آجانا، درختوں کا اجڑ جانا اور گاؤں کے لوگوں کا ہجرت پر مجبور ہو جانا اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ قدرت کا نظامِ انصاف مکافاتِ عمل کی صورت میں کبھی نہ کبھی ضرور ظاہر ہوتا ہے۔

پلاٹ، کردار، واقعات، مکالمے اور وحدتِ تاثر جیسے اہم اجزائے ترکیبی سے کام لیتے ہوئے صائمہ نفیس کہانی کو افسانہ بنانے کی کاوش میں سرگرداں نظر آتی ہیں۔''حمام''،''پچھلے پہر کی خاموشی''،''بلی''،''ٹھنڈا بوسہ'' اور ''تین ڈ'' جیسی کہانیاں روایتی مسائل کو بنیاد بنا کر لکھے جانے کے باوجود بھرپور افسانوی تاثر کی حامل ہیں۔اختصار اور سادہ بیانی ان افسانوں کا وصف ہے۔بعض جگہوں پر بہت اچھے مکالمے بھی پڑھنے کو ملتے ہیں دیکھیے چند مثالیں۔

> ''اور نہ چاہتے ہوئے بھی یہ تماشا دیکھنا ہوگا کہ سنہری تعبیروں والے خوابوں کے عوض ایک مہر ثبت کر کے ہم نے اپنی آنکھیں گروی رکھوادی ہیں۔''(گروی رکھی آنکھیں)

''جب موت کے رقص کی تھاپ پر سانسوں کی ڈور ٹوٹنے لگتی ہے تو گِدھوں کو اپنی زندگی کی نوید سنائی دیتی ہے''۔

(حمام)

''خواہشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔دل کی زمین میں اچانک ہی اُگنے لگتی ہیں کسی خودرَو پودے کی طرح۔نہ کسی موسم کی محتاج، نہ کھاد، مٹی اور بیج کی، بس چاہ کی نمی اُن کو سیراب کرتی جاتی ہے۔

(عورت اور آئینہ)

''وہ ایک لمحہ تھا جو وقت کی گود سے گرا تھا اور اس کی زندگی میں آ کر ٹھہر گیا تھا۔اسے ایسا لگا جیسے بچپن میں برف پانی کا کھیل کھیلتے کھیلتے کوئی اسے برف کر گیا اور پھر اُن کا کھیل تو ختم ہو گیا مگر اُس کے ہم جولی اسے پانی کرنا بھول گئے۔اب وہ وقت کی آنچ سے قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔''

(ٹھنڈا بوسہ)

کسی واقعے کو براہ راست اور من وعن بیان کر دینے سے وہ افسانہ نہیں بن جاتا بلکہ بقول ممتاز شیریں 'روکھی پھیکی رپورتیج' کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔واقعہ نگاری اور حقیقت نگاری میں فرق ہے افسانہ نگار واقعے کے پردے میں چھپی ہوئی حقیقت کو فن کارانہ ہنرمندی سے بے نقاب کرتا ہے۔زیرِ نظر مجموعے میں بیانیہ کی تکنیک اختیار کرتے ہوئے سادگیِ اظہار کے ساتھ سماجی حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ افسانے کے عناصرِ ترکیبی میں باہمی ربط کی وجہ سے اس مجموعے کے کئی افسانوں میں قاری اپنے پورے احساس کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔پرانے افسانے کے برعکس اب جدید افسانے میں حقیقت کا تصور جامد نہیں رہا بلکہ لچک دار ہو گیا ہے۔''عورت اور آئینہ''، ''حمام'' اور ''تین ڈ'' میں کرداروں کی باطنی اور نفسی کشمکش حقیقت کی اسی تہ داری کا مظہر ہے۔اگر صائمہ نفیس کہانی کو اکہرے پن سے بچاتے ہوئے، تخلیقی بصیرت، مشاہدے اور تکنیکی تنوع سے کام لے کر زندگی کی پیچیدہ اور گہری صداقتوں کو منکشف کرتی رہیں اور ایک پختہ تر اسلوب کے لیے مشق ہنر کرتی رہیں تو مستقبل میں اُن کا شمار اچھے افسانہ نگاروں میں ہوگا۔بحیثیت مجموعی ظلم، ناانصافی، بدعنوانی، خوابوں کی شکست وریخت، معاشی کشمکش، جنسی اور ذہنی تشدد، نفسیاتی کیفیات، عورت کی بے توقیری، سیاسی جبر اور دیگر معاشرتی مسائل کو انھوں نے

جس طرح اپنے افسانوں میں اجاگر کیا ہے اُس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "پچھلے پہر کی خاموشی" ہمارے مُردہ سماج کا زندہ بیانیہ ہے۔ میں اس مجموعے کی اشاعت پر انھیں تہ دل سے مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

ڈاکٹر رخسانہ صبا
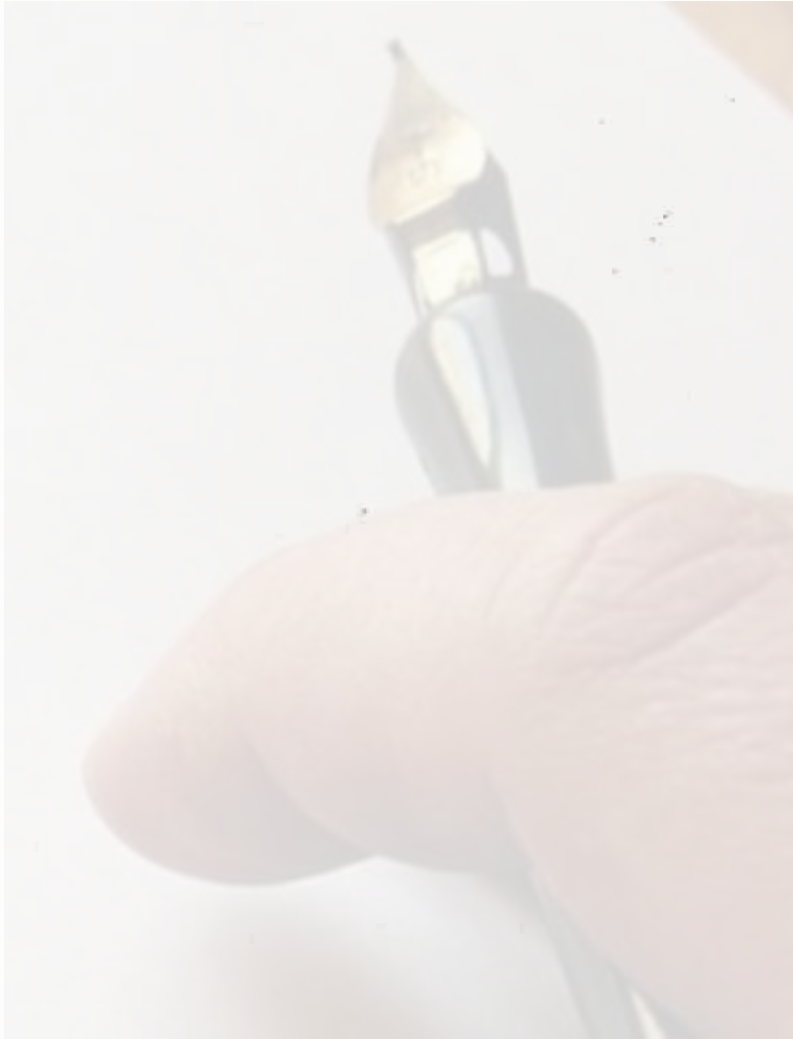
''زندگی کے المیے اور صائمہ نفیس کا مشاہدہ''

گذشتہ چند عشروں کے دوران افسانہ نگار خواتین نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ان میں اکثر، خواتین کے حوالے سے مخصوص سماجی و معاشرتی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں، اگرچہ یہ بات غیر اہم نہیں ہے کہ گھریلو سماجیات کی نزاکتیں جس باریک بینی کے ساتھ خواتین اپنی تحریروں میں منعکس کر سکتی ہیں وہ کسی مرد تخلیق کار کے لیے مشکل امر ہے۔ لیکن فنی اور موضوعاتی حوالے سے تجزیاتی شعور رکھنے والا قاری، خواتین افسانہ نگاروں سے بھی مرد لکھنے والوں کی طرح زندگی کے وسیع منظرنامے کو احاطۂ تحریر میں لانے کی توقع رکھتا ہے۔

یہ امر خوش آئند ہے کہ عہدِ موجود میں خواتین افسانہ نگار بھی زندگی کے دیگر معاملات اور مسائل کو اپنے مشاہدے کی بنیاد پر منتخب کر کے اپنے افسانوں کا موضوع بنا رہی ہیں۔ ان لکھنے والی افسانہ نگاروں میں صائمہ نفیس اپنے تازہ افسانوی مجموعے ''پچھلے پہر کی خاموشی'' کے ساتھ زندگی کے زیادہ وسیع منظرنامے سے موضوعات چُن کر اپنے تحریری ارتقا کے سفر میں اگلے زینے پر کھڑی ہیں۔

لفظ افسانہ حقیقت کی ضد ہے، اور حقیقت ہی زندگی کی اصل ہے۔ افسانے کو حقیقت کی طرح پیش کرنا، اور حقیقت کو افسانے کا رنگ دینا ہی افسانہ نگار کی ہنرمندی ہے۔ میری دانست میں حقیقت کو اگر افسانے کی طرح نہ لکھا جائے تو وہ سادہ کہانی کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ اور تربیت یافتہ قاری کا اسے افسانہ ماننا مشکل ہو جاتا ہے، افسانے کا تربیت یافتہ قاری بیانیے کے افسانوی رنگ کو بخوبی شناخت کر لیتا ہے۔ دوسری طرف یہ امر لکھنے والے کی ہنرمندی پر منحصر ہے کہ وہ اپنی صلاحیت سے زندگی میں پائے جانے والے چھوٹے چھوٹے معاملات کو اس طرح

افسانے میں ڈھالے کہ وہ بڑے معلوم ہونے لگیں۔

صائمہ نفیس کے دوسرے افسانوی مجموعے ''پچھلے پہر کی خاموشی'' میں یہ دونوں عناصر جن کا میں نے اوپر ذکر کیا یعنی حقیقت کو افسانے کی طرح بیان کرنا اور زندگی میں پائے جانے والے چھوٹے چھوٹے المیوں اور دکھوں کو بنت کے زور پر اس طرح پیش کرنا کہ وہ بڑے معلوم ہونے لگیں متاثر کن انداز میں موجود ہیں۔ واضح رہے کہ صائمہ نفیس نے جن چھوٹے، چھوٹے حسّی تجربوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے وہ اس لیے اہم ہیں کہ اگر ان پر توجہ نہ دی جائے تو یہی مسائل بڑے المیوں کی بنیاد بن جاتے ہیں۔

حساس طبعی، تخلیقی آدمی کا بنیادی وصف ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ سماج میں نظر آنے والی محرومی، ظلم، حق تلفی اور معاشرے کے کچلے ہوئے افراد کے المیوں اور دکھوں کو لفظوں میں بیان کر پاتا ہے۔ صائمہ نفیس ایک حساس اور دردمند دل رکھنے والی افسانہ نگار ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''رودالی'' کے عنوان سے 2006ء میں سامنے آیا۔ جسے ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ اُس مجموعے میں شامل افسانوں میں بھی اس تازہ مجموعے کی طرح صائمہ نفیس کی حساس طبعی اور مشاہدے کی باریک بینی کا ثبوت موجود ہے۔ لوگوں کو دکھوں اور غموں سے آزاد دیکھنے کی خواہش صائمہ نفیس کے مزاج میں قدرت نے رکھی ہے جس کا اظہار انھوں نے ''رودالی'' کے پیش لفظ میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

(حوالہ) ''میں خواہش کرتی کاش میرے پاس جادو کی چھڑی آجائے، میں اسے گھمادوں اور دنیا سے ہر غم مٹ جائے، ہر چہرے پر خوشی کا رنگ آجائے، ہر دل مسرت سے بھر جائے اور ہر کوئی شاد ہو جائے مگر ہزاروں خواہشیں ایسی کہ۔۔۔۔۔۔(حوالہ ختم)

صائمہ نفیس کے افسانوں میں رواں زندگی سے جڑے المیوں اور مسائل کو واقعاتی بنت کے ساتھ افسانوی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ مسائل شہری سماج کے بھی ہیں اور دیہی سماج کے بھی۔ اور ان میں جبر، حق تلفی، ظلم اور غیر انسانی سلوک کے عناصر یکساں ہیں۔ اس مجموعے کے اکثر افسانوں میں ایک واقعہ ہے ایک مشاہدہ اور ایک کہانی ہے۔ مگر ان 19 افسانوں میں آخری افسانہ ''دسمبر کا سندیسہ'' خالص محسوساتی بیانیہ ہے۔ دسمبر کی اداس شاموں میں کسی تنہا فرد کو 'درخت سے ٹوٹے پتے کی طرح زمین پر بے یار و مددگار پڑے رہنے کے مماثل قرار دیتے ہوئے، سورج، چاند، دھوپ، سائے، رات کی رانی' اور دسمبر کو اس دکھ میں شریک کر کے، زندگی میں شراکت اور کسی

کی ہم رہی کو جدائی پر ترجیح دینے کا اظہار ہے۔ یہ قنوطیت کے احساس کو ایک رجائی تاثر دیتی خوبصورت تحریر ہے۔ جس میں نہ ہوتے ہوئے بھی زندگی سے جڑا ایک موضوع ہے، ایک بے نام کہانی ہے اور ایک متاثر کن کیفیت ہے۔ یہ پراثر تحریر اپنی کلیت میں قلم برداشتہ ہوتے ہوئے بھی افسانے کا تاثر رکھتی ہے۔

آیئے دیکھیں کہ صائمہ نفیس افسانے کی کرافٹنگ کس طرح کرتی ہیں۔ موضوع ان کے ہاں کس طرح اجاگر ہوتا اور کردار کس طرح واقعاتی بنت میں قاری کی توجہ اپنی طرف قائم رکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔

شہری لوگوں کی طرح دیہات کے مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد بھی نوجوان نسل کے تعلیم یافتہ افراد سے انسان دوستی اور انصاف کی توقع رکھتے ہیں مگر استحصالی سوچ کس طرح اپنے لوگوں کے درمیان پہنچ کر ان نوجوانوں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ چودھری کے یرغمال مزدور میاں بیوی کی امیدوں پر چودھری کا تعلیم یافتہ بیٹا کس طرح پانی پھیرتا اور اس یرغمال کی توثیق کرتا ہے۔ افسانہ ''تبدیلی'' اس جبر کی مثال ہے۔

گھریلو سطح پر گھر کی بزرگ خواتین نو بیاہتا لڑکیوں کو گھر داری اور شوہر پرستی کی نصیحت ضرور کرتی ہیں۔ صائمہ نفیس نے اپنے افسانے عنوان ''محبوبہ'' میں اس نصیحت کی تہہ میں کس جہت کی کمی محسوس کی ہے۔ یہ افسانہ بڑی خوبصورتی سے اُس کمی کو اجاگر کرتا ہے۔

اس افسانوی مجموعے میں بہت واضح طور پر عہد موجود کے مسائل کا عکس موجود ہے۔ انیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے آخری اور تیسرے عشرے کے ابتدائی سال وبا کی تباہ کاریوں کے سبب ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان دنوں میں وبا کے حوالے سے شعراء کا منظوم اظہار خیال تواتر سے سامنے آیا۔ مگر افسانوں میں اس کا عکس بہت کم نظر سے گزرا۔ اس مجموعے میں صائمہ نفیس کا افسانہ ''ہونٹوں سے گرتی دعا'' اس موضوع کی نمائندگی کرتا متاثر کن افسانہ ہے۔

جبر، بدعنوانی، دھوکہ دہی اور کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا گویا ہمارے سماج کی پہچان بن گیا۔ اگر کوئی قلم کار حساس بھی ہے اور گہرے مشاہدے کا حامل بھی تو ان معاملات سے اس کا صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔ صائمہ نفیس کے افسانے ''کڑیاں''، ''گروی رکھی آنکھیں''، ''ٹھنڈا بوسہ'' ان مسائل کو اجاگر کرتی کہانیاں ہیں۔

انفرادی جرم بعض اوقات اجتماعی سزا کا موجب بن جاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ اگر کوئی

خود پر ہونے والے جبر کا جواب نہیں دے سکتا تو اس کا انتقام قدرت خود لیتی ہے، ایسے ہی ایک جبر کی کہانی ماسٹر بدرالدین کی حسین بیٹی کی ہے جو قوت سماعت اور گویائی سے محروم ہے۔ گاؤں کے بچوں اور بچیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے والے ماسٹر بدرالدین کی معصوم لڑکی گاؤں کے چودھری شیر جان کی ہوس کا شکار ہوگئی۔ اور اس کے بعد چودھری کے شریک جرم کارندے، خود چودھری اور پورا گاؤں کس طرح قدرت کی بے آواز لاٹھی کا شکار ہوکر برباد ہوتے گئے۔ یہ سب جاننے کے لیے قارئین کو اس مجموعے کے افسانے ''پچھلے پہر کی خاموشی'' کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ یہ وہی افسانہ ہے جو اس افسانوی مجموعے کا عنوان بھی ہے۔ افسانے کے اس نام کو صائمہ نفیس کی طرف سے کتاب کے عنوان کے لیے منتخب کرنا، معاشرے میں اپنی صنف کے ساتھ روا رکھے جانے والے جرائم کو نہ صرف اجاگر کرنا ہے بلکہ اس پدر سری سماج میں صائمہ کی طرف سے عورت کی مظلومیت پر اپنا احتجاج ریکارڈ کرانا بھی مقصود ہے۔

موضوعات کا تنوع اس مجموعے کو قابل مطالعہ بنانے کے ساتھ افسانہ نگار کے ہمہ جہت مشاہدے اور کتاب کے لیے افسانے منتخب کرتے ہوئے یکسانیت سے بچنے کی پر از ذہانت کوشش کا غماز ہے۔ جیسے افسانہ ''لفظوں کی ردا'' ایک شاعرہ کا فن، اس کا ہنر اس کے راستے کا پتھر بن گیا۔ وہ لفظوں کی ردا اوڑھے شعری مجموعے سامنے لاتی رہی اور ہر شعری مجموعے کے ساتھ وہ معمول کی ازدواجی زندگی سے دور ہوتی گئی۔ مختلف لوگوں کے ساتھ اس کے نام جوڑے جاتے رہے مگر کوئی بھی مستقل اس کے ساتھ نہ چل سکا۔ اور پھر یہ سب کچھ اس کے لیے بے معنی ہوگیا۔ یہ افسانہ ایک سوچتے ذہن کے معمول کی سماجی زندگی میں مِس فٹ ہونے کا بیانیہ ہے۔

بحیثیت قوم ہماری کم مائیگی کا سبب دقیانوسی سوچ پر اڑے رہنا اور وسیع النظری سے گریز کا رویہ ہے۔ ہم نئی مثبت سوچ کو رد اور منفی سوچ کو قبول کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتے۔ ایسی ہی صورتحال کا سامنا ''سپر سسٹم'' نامی افسانے کے مرکزی کردار ندیم کو کرنا پڑا، اس کی اعلیٰ تعلیم، روشن خیالی اور یونیورسٹی کے طلبہ کو وسیع النظری کی تعلیم سے آراستہ کرنے کی کوشش کو کس طرح سماج دشمن اور اینٹی اسٹیٹ قرار دے کر اس کے کیریئر کو تباہ کیا گیا۔ یہ افسانہ توجہ سے پڑھنے اور محسوس کرنے کے لائق ہے۔

''بلی'' نامی افسانہ بھی مردانہ شاؤنزم اور عورت کو اسیر کرنے کے غیر انسانی عمل کی تصدیق کرتا ہے۔ کشادہ دلی سے عاری حویلی کا مکین ارباز خان گاؤں کے ماسٹر رب نواز کی شہر میں

مقیم بیٹی کے ڈرائیونگ کے انداز سے مرعوب ہوا۔ شادی کی اور سب سے پہلے اس کے باہر نکلنے اور ڈرائیونگ پر پابندی لگادی۔ اور یہی وہ عمل ہے جو مرد کی طرف سے عورت پر حکومت کرنے اور اُسے دوسرے درجے کی شہری سمجھنے کے ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت فراہم کرتا اور یہی وہ نفسیاتی ٹیڑھ ہے جسے انسان کے لاشعور سے کھرچ پھینکنے کی ضرورت ہے۔

صائمہ نفیس کے اکثر افسانے المیہ اختتام کی طرف اشارہ کرتے ہیں خصوصاً وہ افسانے جس میں خواتین کرداروں پر جبر کو موضوع بنایا گیا ہے' اس رویے کا سبب عملی زندگی میں افسانہ نگار کے تجربے میں آنے والے تلخ تجربات اور مشاہدات کی وجہ سے طاری ہونے والی چڑچڑاہٹ ہوسکتی ہے۔

مگر ان افسانوں کے بیچ ''اسیری'' نام کا افسانہ جس میں رابعہ نے اپنی بیٹی کی پسند کو نظرانداز کرنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے اور اسکی بیٹی اپنی محبت کو پانے کے لیے بضد ہے' پھر کس طرح رابعہ اپنے ماضی کی محرومیوں کو یاد کرتے ہوئے۔ اپنی بیٹی سوہا کی محبت میں خود کو بے بس خیال کرتے ہوئے سوہا کی پسند کبیر سے ملنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ پھر ایک دن کبیر کے والد بیٹے کی وکالت کے لیے رابعہ کے دفتر پہنچ جاتے ہیں' اس مرحلے پر مضبوط رابعہ کی قلبی کیفیت کیوں متغیر ہوئی اور اُس نے کیسے اپنی بیٹی سوہا کے لیے جبران کے بیٹے کبیر کا رشتہ قبول کرلیا۔ جبکہ وہ محبت کو ایک فضول اور وقتی احساس سمجھتی تھی۔ خالص نسائی کیفیت کے زیراثر تفصیلی بیانیے سے آراستہ یہ افسانہ اپنے بیانیے اور ٹریٹمنٹ میں خواتین کے رسائل میں شائع ہونے والے افسانوں سے مختلف تاثر کے ساتھ کلائمکس پر پہنچتا ہے۔ افسانے کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ آپ اس میں کتنی جزئیات شامل کرسکتے ہیں۔ اپنے موضوع اور نپے تلے ٹریٹمنٹ کے حامل افسانے بعض اوقات اپنی غیرضروری طوالت کی وجہ سے تاثر سے محروم رہتے ہیں۔ ''اسیری'' نامی یہ افسانہ اپنی زیادہ جزئیات نگاری کے باوجود تاثر قائم رکھنے میں کامیاب رہا ہے۔

''دروازہ''، ''پانچوں بوتل'' اور ''تجاوزات'' ایسے افسانے ہیں جن کا موضوع افلاس، غربت اور بدحالی کی چکی میں پسنے والے جیتے جاگتے وہ کردار ہیں جو اپنی خوشی سے نہیں بلکہ حالات کے جبر سے تنگ آکر اخلاقیات کے منافی راستے اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ صائمہ نفیس کے یہ افسانے تصدیق کرتے ہیں کہ بھوک کی کوئی اخلاقیات نہیں ہوتی۔

اس افسانوی مجموعے میں ایک اہم افسانہ ''تین ڈ'' پدرسری سماج کے جبر، اور نسائی

حسیت کے ٹکراؤ کی نمائندگی کرتا ایک ایسا افسانہ ہے جو گھریلو سماج میں مردانہ جبر کے نتیجے میں گھر میں موجود بچوں کو نفسیاتی مریض بنانے کا المیہ بیان کرتا ہے۔ اپنی ماں پر باپ کے ہاتھوں تشدد ہوتا دیکھ کر ایک بچی جوان ہونے تک کس ذہنی کرب سے گزرتی ہے۔ اپنی عملی زندگی میں وہ کس طرح کے فیصلے کرتی ہے، اور یہ فیصلے اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلتے ہیں اور بالآخر وہ کیوں ایک مخنس کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا کر خود کو مرد کے شر سے محفوظ تصور کرنے لگتی ہے۔ ایک مختلف اختتام کا حامل افسانہ جو مرد کے ظلم سے خائف عورتوں کو فرار کے ایک نئے رخ سے متعارف کراتا ہے۔ اس افسانے میں تین ''ذ'' کن عناصر کی نمائندگی کرتے ہیں' یہ افسانے کے مطالعہ سے معلوم ہوسکتا ہے۔

''پچھلے پہر کی خاموشی'' کے افسانے سماج کی بالکل اندرونی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات، عام آدمی کی نظر سے اوجھل رہنے والے کرداروں کے المیوں اور دکھوں کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ پہلے افسانوی مجموعے ''رودالی'' کے بعد اپنے دوسرے زیر نظر افسانوی مجموعے میں بھی صائمہ نفیس نے سماج کے پوشیدہ زخموں کو افسانوں کے ذریعے منظر عام پر لانے کی کوشش کر کے دراصل اس جبر کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کے قابل تقلید عمل کا آغاز کیا ہے۔ یہ دراصل انسان کے انسان پر ظلم کے خلاف شعور بیدار کرنے کا عمل ہے، یہ افسانے مشتہر ہونے' توجہ سے مطالعہ کیے جانے اور ان کی روشنی میں سماجی ناانصافیوں کے ازالے کی سمت متعین کی جاسکتی ہیں۔ صائمہ نفیس اس مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد کی مستحق ہیں۔

سلمان صدیقی

آئینہ صفت افسانہ نگار

افسانہ کیا ہے؟ حقیقت اور کہانی کے درمیان کی کوئی شے ہے یا چوک پر لگا ہوا ایک ایسا آئینہ۔۔۔جو ہر راہگیر کا منہ چڑاتا ہے یا پھر افسانہ اُس زندگی کی کہانی ہے جو ہم گزار نہیں پاتے۔کیا یہ سچ ہے؟۔نہیں اب ایسا بھی نہیں۔ہم زندگی کو گزاریں یا زندگی ہمیں گزارے، کہانی تو بنتی ہے نا۔۔اور کہانی افسانے کی ماں ہے۔۔افسانے کو جنم دیتی ہے۔۔افسانہ درد کی ایک کتھا ہے ۔۔۔جو لکھنے والا آنسوؤں سے لکھتا ہے۔۔۔افسانہ آنسوؤں کا وہ رنگ ہے جو بینائی دیکھ نہیں سکتی ۔۔۔وہ چیخ ہے جو سماعت سن نہیں سکتی۔۔۔وہ دکھ ہے جو سہا نہیں جاتا اور۔کہا بھی نہیں جاتا لیکن یہ افسانہ نگار کی خوبی ہے کہ وہ اِن اَن کہے اور اَن سنے دکھوں کو داستان بناتا ہے۔چند لفظوں کی داستان۔۔

افسانہ تعریف کے کسی سانچے میں فکس نہیں ہو پاتا۔اگرچہ آج تک بہت ساری تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔عصرِ حاضر میں افسانہ شاید ایک بار پھر اپنی شکل وصورت بدل رہا ہے اور Micro Fiction جسے اردو میں ''افسانچہ'' کا نام دیا گیا ہے، عام ہوتا جارہا ہے جس میں الفاظ بہت کم ہوتے ہیں اور سطور سے بہت زیادہ بین السطور کو پڑھا جاتا ہے۔بہر حال یہ تو ایک الگ اور وسیع موضوع ہے۔۔ابھی ہم بات کر رہے ہیں روایتی افسانے کی جو عہدِ قدیم میں پریم چند سے شروع ہو کر عصمت چغتائی اور منٹو کے بعد مختلف رنگ، نام اور چہرے بدلتے ہوئے آج کی افسانہ نگار صائمہ نفیس تک آتا ہے۔

صائمہ نفیس ایک بہ تدریج سامنے آنے والی شخصیت ہیں۔اُن کا افسانوی سفر ایک طویل عرصے سے جاری ہے۔۔۔اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ 2006 میں ''رودالی'' کے نام سے سامنے آیا تھا۔۔اور

اب ایک طویل عرصے کے بعد صائمہ ایک بار پھر اپنے خوب صورت افسانوی مجموعہ ''پچھلے پہر کی خاموشی'' کے ساتھ سامنے آئی ہیں۔ اتفاق سے اُن کی پہلی کتاب کی تقریبِ رونمائی میں ہم نے بھی شرکت کی تھی اور حسنِ اتفاق سے کتاب پر بولنے والے مقررین میں بھی ہم اور ہماری رائے شامل تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طویل سفر میں صائمہ نفیس کے افسانے نے ایک ارتقائی سفر طے کیا ہے اور ان کی موجودہ کتاب ''پچھلے پہر کی خاموشی'' کے افسانوں کا مطالعہ کر کے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے افسانوی حسن میں ایک دو قدم آگے بڑھی ہیں بل کہ انہوں نے موضوعات کی جدت اور ندرت میں بھی ایک جست لگائی ہے۔۔ اب وہ زندگی کو زیادہ قریب کی عینک سے دیکھ رہی ہیں لیکن جس طرح ہونہار پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں اسی طرح صائمہ کی پہلی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے اُس وقت کہا تھا کہ ''اگرچہ صائمہ نفیس کی یہ پہلی کتاب ہے لیکن کسی کسی افسانے میں الفاظ کا بانکپن اور بات کہنے کا جداگانہ انداز اُس کے اندر جنم لیتی ایک بڑی افسانہ نگار کا چہرہ دکھا جاتا ہے۔ صائمہ نفیس کے کردار ہمارے اردگرد سانس لیتے ہم ہی جیسے انسان ہیں چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں خوش اور دکھوں پر اداس ہونے والے عام لوگ۔۔۔ جن کو تراش خراش کیے بنا وہ کسی لفاظی کے کا سہارا لیے بغیر اپنے افسانوں میں پیش کر دیتی ہیں۔ صائمہ نے دوسروں کے درد کی روشنائی اپنے قلم میں بھر لی ہے تا کہ وہ کچھ اور شاہکار تخلیق کر سکے۔''

ہم نے پہلے بھی یہ بات لکھی تھی کہ صائمہ کو جملہ لکھنے کا فن آتا ہے۔ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یا حسن اُن کا اختصار ہے۔ اس کے افسانے میں پسِ تحریر بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ جس نکتۂ اختتام پر کہانی کو ختم کرتی ہے دراصل افسانہ وہیں سے شروع ہو رہا ہوتا ہے۔ پچھلے پہر کی خاموشی'' کا ایک دل گداز افسانہ ''حمام'' تھر کے قحط میں بچوں کی اموات کے تناظر میں لکھا گیا ہے، جب موہل یہ دیکھتی ہے کہ اس کے بچے کی جان کو خطرہ ہے اور اس کے لالچی سسرال والے حکومت سے محض ۵۰ ہزار حاصل کرنے کے لیے اُس کے بچے کو پیدا ہونے سے قبل ہی مارنا چاہتے ہیں تو وہ اپنے میکے آجاتی ہے۔ چند سطور دیکھیے:

> ''موہل نے سوچا مجھے اسی وقت بات کر لینی چاہیے ابھی اماں بابا دونوں موجود ہیں، یہ سوچ کر ماں کے جاتے ہی وہ بھی یہ سب سوچ کر پیچھے پیچھے چل دی۔ ابھی اماں بابا کے کمرے کے دروازے پر ہی پہنچی تھی کہ بابا کی آواز نے اس کے قدم وہاں ہی رک دیے وہ اس کی آمد سے بے خبر

اماں سے کہہ رہا تھا! 'موبل کو اس کے گھر بھیج دو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ یہاں رک جائے اور ماہار کو ہمیں اس کے میکے بھیجنا پڑے زچگی کے لئے۔ پھر تو مجھ سے شکوہ نہ کرنا کہ میرا بیٹا شادی کے بعد مجھ سے دور ہو گیا ہے۔اور میرے ہاتھ سے زمین بھی نکل جائے گی بڑے موقعے کی زمیں مل رہی ہے۔ پھر گورمنٹ کہاں بار بار یہ اعلان کرتی ہے کہ زچگی کے دوران مرنے والی زچہ اور بچہ کے ورثہ کو دو لاکھ ملیں گے۔''

عام طور پر خاتون افسانہ نگار کے افسانوں کا ایک مرکزی موضوع عورت ہوتی ہے۔بہ حیثیت ایک عورت ہونے کے وہ جن دکھوں سے گزرتی ہے ان کا عکس تحریر میں آنا یوں بھی ایک فطری سی بات ہے لیکن صائمہ کے ہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ درد کو عورت اور مرد کے درمیان تقسیم نہیں کرتی ہیں ۔ وہ جس زندگی کی بات کرتی ہیں وہ انسان کی زندگی ہے۔انسان کے دکھ ہیں۔۔یہ زندگی ہمارے ساتھ ہنستی ہے اور ہمارے ساتھ روتی ہے۔۔مرد بھی درد محسوس کرتا ہے اور اسی طرح زندگی سے نبرد آزما ہوتا ہے جیسے عورت۔۔ایک ایسے ہی نوجوان کی کہانی صائمہ نے ''سپر سسٹم'' کے عنوان سے لکھی ہے۔۔۔جس میں ایک بے انتہا قابل نوجوان اپنے والد کے کہنے پر بیرونِ ملک سے پاکستان واپس آتا ہے اور یہاں جب ایک بڑے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے تو کس طرح محکماتی سازشوں کا شکار ہو کر نہ صرف ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے بل کہ ہوش وحواس سے بیگانہ بھی ہو جاتا ہے۔

''ندیم اُسے غور سے دیکھنے لگا اور سوچنے لگا یہ کیوں سو رہا ہے اگر یہ سوتا رہے گا تو ہمارا ملک کیسے ترقی کرے گا ترقی نہیں کرے گا تو ہم کیسے ایک سپر سسٹم بنا سکیں گے اسے جاگنا ہوگا۔ میں اسے جگاؤں گا اپنے ملک کی ترقی کے لئے ایک سپر سسٹم کے لئے یہی سوچ کر ندیم اُس بینچ کی طرف بڑھا دیکھا تو قریب ہی ایک بھاری پتھر پڑا تھا۔ندیم نے ہمت و کوشش سے وہ بھاری پتھر اُٹھایا اور اُس خواب دیکھتے مزدور کو جگانے کی خاطر اُس کے سر پر دے مارا۔مزدور کی آنکھیں تکلیف کی اذیت سے کھل گئیں مگر دھڑکنیں خاموش ہو گئیں ندیم مردہ شخص کی کھلی آنکھیں دیکھ کر خوش ہو گیا مگر جب اُس نے گردن گھما کر دیکھا تو کچھ فاصلے پر ایک دوسرا شخص

گہری نیند سو رہا تھا ندیم اب اُسے جگانے اُس بینچ کی طرف بڑھ رہا تھا اور
اُس کی نظریں بھاری پتھر پر مرکوز تھیں۔۔۔''

صائمہ نفیس ایک ایسی افسانہ نگار ہیں جو کارِ ہنر کی انفرادیت، احساس کی سچائی، تخیل کی بلندی اور اپنے وجدان کی طاقت سے اپنی تحریر کو سجاتی ہے۔ان کے ہاں تحریر کو فلسفے یا کسی خاص نظریے کا بگھار نہیں لگایا جاتا۔۔۔موٹی موٹے ادِق الفاظ کا منتر پڑھ کر نہیں پھونکا جاتا بل کہ نہایت سادگی اور خلوص، لیکن افسانویت برقرار رکھتے ہوئے بات آگے بڑھائی جاتی ہے۔اُن کی کہانی میں افسانہ اور افسانے میں کہانی موجود ہوتی ہے اور یہی سب سے اچھی اور اہم بات ہے۔ورنہ تو آج کل افسانے سے کہانی غائب ہوتی جارہی ہے۔صائمہ نے ایک بہادر سرجن کی طرح معاشرے کے اُن ناسوروں کو عیاں کیا ہے،جن کی نقاب کشائی کرنے سے پہلے سو بار سوچنا پڑتا ہے۔

افسانہ ''گروی رکھی آنکھیں'' کی چند خوبصورت سطور پڑھیے اور صائمہ نفیس کی افسانویت کا لطف اُٹھایئے۔۔

''دیکھا تو سب نے۔۔
اور سمجھا بھی سب نے۔۔۔
مگر اچانک آنکھوں دیکھے منظر بدل گئے۔۔
زیر زبر،شین قاف سب تبدیل کر دیے گئے اور قیامت کی مثال کچھ اس طرح واضح ہوگئی کہ۔۔
خام کو جام بنادیا گیا
یہ جام سب کو بانٹ دیا گیا
پھر اس جام کے نشے میں سب بدمست ہو کر ناچنے لگے اور نہ کہنا بھول بیٹھے۔
اب نجانے یہ تماشہ کب ختم ہوگا۔۔۔
اور نہ چاہتے ہوئے بھی یہ تماشہ دیکھنا ہوگا کہ سنہری تعبیروں والے خوابوں کے عوض ایک مہر ثبت کر کے ہم نے اپنی آنکھیں گروی رکھوا دیں ہیں۔''

صائمہ نفیس کے اِس دیدہ زیب ٹائیٹل کیساتھ خوب صورت افسانوی مجموعہ کا حسن اس کے افسانے ہیں۔افسانوں کی سیرت تو عمدہ ہے ہی لیکن ان کی صورت یعنی عنوانات بھی بہت منفرد ہیں۔

مثال کے طور پر اسیری۔۔تین د۔۔بلی۔۔ٹھنڈا بوسہ۔۔کڑیاں۔۔۔ پانچویں بوتل۔۔ دروازہ وغیرہ۔

صائمہ خود بھی ہر دم ہنسنے ہنسانے اور خوش وخرم رہنے والی تخلیق کار ہیں۔۔وہ خود بھی خوش رہتی ہیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھتی ہیں۔تخلیق کے تسلسل کی قائل ہیں اور ادب کے فروغ میں قلم کے علاوہ بھی مختلف انداز میں اپنا حصہ ڈالتی رہتی ہیں۔ہم نے انہیں ایک آئینہ صفت افسانہ نگار اس لیے قرار دیا ہے کہ وہ جو دیکھتی ہیں وہ پوری سچائی کے ساتھ لکھ دیتی ہیں۔کسی آئینے کی طرح جو سچ کو چھپانے سے قاصر ہوتا ہے۔چاہے وہ سچ دنیا کے لیے ناقابلِ قبول ہی کیوں نہ ہو۔

صائمہ نفیس کا یہ افسانوی مجموعہ ''پچھلے پہر کی خاموشی'' ایک ایسی کتاب ہے جسے یقیناً اُن لوگوں کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے جو افسانے کے زوال کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

حمیرا راحت

افسانے

عورت اور آئینہ

'آپ آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے آپ سے باتیں کیا کریں اور اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا کریں کہ 'میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ہے میں بہت خوش ہوں کہ میں بہت خوب صورت ہوں صحت مند ہوں اور زندہ سلامت ہوں۔۔۔'

ڈاکٹر مبین رانی کو یہ سب کہہ رہے تھے۔ مگر رانی کے چہرے کے تاثرات ہر قسم کے جذبے سے عاری تھے اس کی آنکھوں میں گہری رات جیسا سناٹا اور چہرے پر طوفان کے گذر جانے کے بعد کی خاموشی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنا راونڈ مکمل کر کے چلے گئے تو نرس نے رانی کو مشق کرانے کے لیے آئینے کے سامنے بیٹھا دیا۔

آئینے اور عورت کی دوستی بھی عجیب ہے۔ یہ عورت کا سب سے بڑا راز داں ہے اور راز داں بھی ایسا کہ کسی دوسرے کو کبھی کچھ نہیں بتاتا۔ مگر آئینہ جھوٹ نہیں بولتا اور عورت سچ پسند نہیں کرتی۔ وہ سچ سے زیادہ جھوٹ پر یقین کر لیتی ہے اور اپنا دامن کانٹوں سے بھر لیتی ہے۔

رانی پہلے تو آئینے سے آنکھیں چراتی رہی اور آئینہ بھی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر اُس نے اپنی خاموشی کا قفل کھولا!

''تم تو مجھے نا جانے کب سے جانتے ہو۔ مجھے نہیں معلوم میری تمہاری دوستی یا جان پہچان کب سے ہوئی یہ بہت پرانی بات ہے، اور پرانی باتوں کی بھی عجیب چاشنی ہے، بالکل پرانی شراب جیسی''۔

دولہن بننے کے بعد جب اُس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو اُسے اپنا آپ بہت پیارا لگا۔

''دیکھ لو۔۔یہ ہوں میں!''

اِس نے ایک شانِ بے نیازی سے اپنی گردن کو ایک خاص انداز سے اکڑا کر آئینے سے سرگوشی کی۔

اُس وقت تو آئینہ خاموش رہا۔مگر جب چار دن بعد وہ آئینے کے سامنے آئی تو آئینے نے اُسے بہت رولایا۔

ابھی ولیمے کو دو ہی دن بیتے تھے کہ اُس کے مجازی خدا نے اس سے زیور اور سونے کی چوڑیاں اُتار کر اُسے واپس کرنے کو کہا۔

رانی نے دینے سے انکار کر دیا۔

تو۔۔۔۔

ایک زوردار طماچہ اُس کے ہونٹوں کو زخمی کرتا اُسے حیران و پریشان کر گیا۔پھر اُسے بتایا گیا کہ چھوٹی شان کے لیے اصلی زیور کرائے پر اُدھار لیے گئے تھے۔جنھیں اب واپس کرنا ہے۔

''بیٹا زندگی میں بہت اُتار چڑھاو آئیں گے مگر یاد رکھنا اب یہ ہی تمہارا گھر ہے اور نذیر تمہارا زندگی بھر کا ساتھی۔اب تم ہمارے لیے پرائی ہوگئی ہو''۔

اماں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے جو اُنھوں نے رخصتی کے وقت اُسے کہے تھے۔رانی اماں کو یہ باتیں کیسے بتائے اور بتائے بھی یا نہیں۔۔اماں نے خود ہی تو کہا تھا کہ اب تم پرائی ہوگئی ہو۔یہ ہی سوچ کر وہ آئینے کے سامنے جا بیٹھی۔

پھر آئینے نے اُس کی صورت اُسے دیکھائی!

تو رانی کی آنکھوں سے ساون بھادو شروع ہوگیا اپنے خوبصورت چہرے پر یہ نشان اسے درد سے زیادہ دُکھ کا احساس دے رہا تھا۔درد زیادہ تھا یا دُکھ، وہ حساب ہی نہ لگا پا رہی تھی۔مگر آنکھوں کے سارے بند ٹوٹ گئے اور کھارا پانی بہنے لگا۔

''اماں کیا زندگی بھر کا ساتھ ایسا ہوتا ہے؟ کیا یہ ہے میرا گھر اور میرا گھر والا؟''

بہت زیادہ رونے کے بعد دل کو تھوڑا سا سکون ملا اور اپنے آپ ہی بہت سے سوالوں کے جواب بھی،تو اس نے سمجھوتے کی چادر کو چُن لیا اور اُسے اُڑھ کر خاموشی سے زندگی کے پہیے میں شامل ہو کر گھومنے لگی۔مگر اب آئینے سے اُس کی دوستی پکی ہوگئی تھی اور آئینہ اُس کا رازدار بھی

بن گیا تھا، وہی نذیر کی دی ہوئی چوٹوں کے نشان چھپانے میں اُسکی خاص مدد بھی کرتا تھا اور نشانوں کے مدھم پڑ جانے کی اطلاع بھی دیتا۔

پھر ایک دن آئینے کو اُس پر رحم آ گیا اور اس دن اُسے اپنا روپ ایک بار پھر پیارا لگا ۔جبکہ آج کل تو اس کا بدن بے ڈھنگا ہو گیا تھا مگر آئینہ اُسے بتا رہا تھا کہ وہ بہت خوبصورت لگ رہی ہے کہ وہ مکمل ہونے جا رہی ہے ممتا کی چمک اُسکی آنکھوں کو خیرہ کیے ہوئے ہے۔گالوں کی لالی، نکھری نکھری رنگت اور اُس کے پورے وجود کو کسی کے آنے کا انتظار تھا۔وہ جو اُس کے اُنگ کا حصہ اس کی پرچھائیں اس کی رگوں میں بہتے خون کا حصہ دار، اس کی ڈھڑکن کی گنگناہٹ، بلا وجہ ہونٹوں کی مسکراہٹ، اُس کا بچہ۔۔۔!

نو ماہ کا انتظار کھینچنے اور درد کے ایک سمندر کو عبور کرنے کے بعد بیٹے کی صورت میں ایک سیپ اُس کے ہاتھ لگا۔

اس کے بعد اس کی دوستی آئینے سے کم اور سیپ کے موتی سے زیادہ ہو گئی۔آہستہ آہستہ ان موتیوں کی تعداد زیادہ ہونے لگی تو ذمہ داریوں کا بوجھ بھی بڑھنے لگا اور ایسے میں تو وہ اپنے ہم راز کو بالکل ہی بھول گئی اب تو کئی کئی دن گذر جاتے دونوں کو ایک دوسرے کا سامنا کئے ۔ایک دن اس کی ہمسائی زرینہ نے اُسے اطلاع دی کہ اُس نے نذیر کے ساتھ ایک دوسری عورت کو دیکھا ہے۔

رانی نے اَن سنی کر دی بھلا نذیر کو مجھ سے کیا شکایت ہو گی۔میں نے تو کبھی کوئی شکایت کوئی گلہ نہیں کیا۔اُس نے خود ہی اپنا احتساب کیا۔ضرور یہ زرینہ کا وہم ہو گا۔لیکن جب ایک دن یہ وہم اُس کے سامنے حقیقت بن کر آیا تو وہ ایک بار پھر آئینے کے سامنے جا بیٹھی لُٹی پُٹی ۔مگر آج آئینہ بھی خاموش تھا رانی خود ہی سوال کرنے لگی۔

''ایسا کیا ہے اُس میں ؟''

''میری آنکھیں اُس سے زیادہ خوبصورت ہیں ناں؟''

آئینے نے ''ہاں'' کہا!

'میری صورت ،میرے بال ، میرے ہونٹ، میری رنگت ،میرا قد ،میرا جسم اور میرا پیار۔۔۔'

آئینہ بار بار ہاں کہہ رہا تھا۔

''پھر ایسا کیا ہے؟ کہ نذیر دوسری عورت کے لئے پاگل ہو رہا ہے''۔

اس کا جواب آئینے کے پاس نہیں تھا۔آئینہ خاموش تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

رانی کو اُس کی خاموشی نہ بھائی تو اُس نے بھاری گلدان آئینے پر دے مارا۔۔صرف ایک چھناکا ہوا اور بس سب کچھ ٹوٹ گیا۔اُس نے اپنے دوست اپنے ہم راز کو مار ڈالا مگر ٹوٹی کرچیاں سمیٹتے ہوئے خود ہی کو زخمی کر بیٹھی۔

پھر یہ دوستی ختم ہوگئی۔

اُس دن جب اُس کا بڑا بیٹا پتنگ اُڑاتے چھت سے نیچے گرا اور اس کے زخمی سر سے خون بہنے لگا تو رانی بدحواس ہوگئی۔جس حُلیے میں تھی ویسے ہی اُسے لے کر قریبی ہسپتال بھاگی محلے والوں کی اطلاع پر نذیر بھی پہنچ گیا،مگر جب اُس نے رانی کو چادر کے بغیر ہسپتال میں دیکھا تو اُسے بے شرم، بے حیا کہہ کر وہاں ہی اُسے طلاق دے دی۔ کچھ دونوں کے بعد ہی دوسری عورت رانی کے گھر نذیر کی مہارانی بن کر آگئی۔وہ دوسری عورت نذیر کو بہت پارسا لگی جو ایک شادی شدہ مرد سے بغیر کسی رشتے کے ملتی تھی۔اور رانی اُسے بدکردار لگی جو اپنے بیٹے کی مرہم پٹی کے لئے اکیلی ہسپتال آگئی۔۔۔عورت کے کردار کو جانچنے کے مرد کے معیار اتنے مختلف کیوں ہوتے ہیں۔

چونکہ یہ سارا واقعہ ہسپتال کے عملے کے سامنے ہوا تھا اور دیگر لوگ بھی وہاں موجود تھے۔انھیں میں مسز سید بھی شامل تھیں جو وہاں اکثر جایا کرتیں تھیں۔مسز سید کا تعلق ایک رفاعی تنظیم سے تھا اور وہ ایک دردمند دل بھی رکھتیں تھیں۔مسز سید ہی کے کہنے پر رانی کو ہسپتال میں ہی ٹھہرالیا گیا۔بعدازں وہ رانی کو اپنے گھر لے گیئں جہاں انھوں نے اُسے اپنے گھر میں ملازمت بھی دے دی اور رہنے کی جگہ بھی۔

رانی ایک صابر اور محنتی عورت تھی چنانچہ اُس نے مسز سید کے گھر اور دل میں اپنی جگہ بنا لی۔لیکن اُس کا دل اپنے بچوں کی یاد میں غم زدہ رہتا۔مسز سید کے گھر سے ملنے والی تنخواہ سے وہ اپنے بچوں کی کفالت بھی کرنے لگی۔اس طرح اُسے اپنے بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے کا موقع مل جاتا اور اُس کے دل کو سکون۔۔۔۔

نذیر نے دُوسری شادی کر لی اور وہ بچوں سے بھی لاپرواہ ہوگیا۔پھر جب بچوں کی ضروریات رانی کی تنخواہ سے پوری ہونے لگی تو وہ مکمل طور پر دوسری عورت کی زلف کا اسیر بن گیا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ نہ چل سکا کہ نذیر کی دوسری بیوی نہ تو رانی کی طرح مار پیٹ سہہ سکی اور نہ ہی اپنی

خواہشات کو مار کر زندگی گذار سکی، وہ ایک دن نذیر کے گھر کو چھوڑ کر چلی گئی اور بعد میں کوٹ میں خلع کا مقدمہ بھی کر دیا۔۔۔

نذیر کے پاس اب اُسے طلاق دینے کے کوئی دُوسرا راستہ نہ تھا۔ مگر ہمیشہ اپنی من مانی کرنے والے نذیر کو اپنی یہ شکست قبول نہ ہوئی۔ اپنی اُنا کا غلام زرینہ کا یہ وار نہ سہہ سکا اور بیمار ہو گیا۔ جسم سے زیادہ رُوگی اُس کا ذہن تھا۔ اور ذہن کے رُوگی کا کوئی علاج نہیں ہوا اُسی بیمار ذہنیت کے ساتھ دس سال گذر گئے۔

اِن دس سالوں میں رانی ہی کے دیئے ہوئے پیسوں سے گھر کا خرچا چلتا رہا اور ساتھ ساتھ اس کے بچے بھی چھوٹا موٹا کام کرنے لگے۔

پھر ایک دن نذیر مر گیا! نذیر نے یہ دنیا چھوڑنے میں دس سال لگا دیئے۔ رانی اُس دن بھی بہت روئی۔۔۔۔

مگر اُس دن پھر رانی کے دل میں ایک خواہش جا گی کہ اب وہ دوبارہ اپنے بچوں کے پاس رہنے لگے گی اُن کے ساتھ!

خواہشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں دل کی زمین میں اَچانک اُگنے لگتیں ہیں کسی خودرو پودے کی طرح نہ کسی موسم کی محتاج، نہ کھاد مٹی اور نہ بیج کی۔ بس چاہ کی نمی اِن کو سیراب کرتی جاتی ہے۔

اُس نے مسز سید سے بھی بات کر لی کہ یہ اُس کی خواہش ہے ۔ مسز سید نے اُسے با خوشی اجازت بھی دے دی۔

مگر جس روز وہ اپنے بقایا جات اور ڈھیروں سامان کے ساتھ اپنے بچوں سے ملنے گئی تو اس کے بیٹوں نے اُسے اپنے ساتھ رکھنے سے منع کر دیا۔ بقول اُن کے اَبا کی وصیت ہے کہ میرے مرنے کے بعد بھی رانی اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ یہ میرا گھر ہے۔ رانی کا نہیں۔

رانی آج بھی حیران تھی کہ اپنی عمر کی تمام پونجی وہ اُن پر لٹاتی رہی، اُن کی ہر ضرورت کا خیال رکھا دور رہ کر بھی اِنھی کے بارے میں سوچتی رہی مگر آج اُن کو اَپنے مرے ہوئے باپ کی وصیت یاد ہے، لیکن زندہ ماں کا خیال نہیں۔ اُس دن اُسے نفرت کی سفاکی کا اندازہ ہو گیا۔ وہ تہی دامن، تہی دست اور تہی دل ہو کر ایک بار پھر مسز سید کے گھر واپس آ گئی۔ مگر جو رُوگ اُس کی روح کو لگا اُس نے اِس کے جسم کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا اور وہ ذہنی بیمار رہنے لگی۔

مرض زیادہ بڑھا تو اُسے ہسپتال میں داخل کروانا پڑا۔

جب زمین بنجر ہو جاتی ہے تو اس میں کچھ نہیں اُگتا لیکن جب دل بنجر ہو جائیں تو ان میں خواہشیں نہیں اُبھرتی، خواہشوں کا اُبھرنا ہی زندگی کی علامت ہے۔رانی خاموش رہتی نہ ہنستی اور نہ ہی کسی بات میں اپنی دلچسپی ظاہر کرتی۔

آج جب ڈاکٹر مبین نے اُسے آئینے سے باتیں کرنے کا مشورہ دیا تو رانی خاموشی سے انھیں دیکھتی رہی۔نرس نے رانی کے بیڈ کے سامنے ایک قد آدم آئینہ لا کر رکھ دیا۔شروع شروع میں تو رانی نے اُسے کوئی اہمیت ہی نہ دی، بلکہ کروٹ بدل لی پھر آہستہ آہستہ اس نے آئینے سے آنکھیں ملانی شروع کیں۔

آج مدت بعد جب رانی نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو خود کو پہچان ہی نہ پائی۔
وہ خود کو ڈھونڈ رہی تھی وہ اپنے آپ کو مل ہی نہیں رہی تھی۔اور آئینہ نا معلوم کیسے دیکھا رہا تھا۔

اپنی آنکھیں!

اپنے ہونٹ!

اپنا چہرہ!

اپنے بال!

اپنی رنگت!

اپنا جسم!

وہ آئینے میں ڈھونڈ رہی تھی مگر آج پھر آئینہ خاموش تھا۔

''تم بھی ناراض ہو مجھ سے؟''

وہ اسے منانے لگی۔

''سنو مجھے واپس لوٹا دو۔میں تم میں کہیں گم پڑی ہوں۔تمہارے ماضی میں مدفن، مجھے ،مجھ سے ملوا دو''۔

اَچانک ایک خواہش اُبھری۔

مگر آئینہ خاموش تھا۔

اُسے اِس کے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہا تھا۔۔۔جو وہ سننا چاہ رہی تھی

اور جو جواب آئینہ اُسے دے رہا تھا وہ اُسے منظور نہ تھا۔ نا معلوم وہ کس سے اُسے ملوا رہا تھا اُس کی بات ہی نہ سن رہا تھا۔ بلکہ کہہ رہا تھا کہ

''اب یہ ہو تم''۔

رانی نے غصے میں ٹیبل پر پڑا گلاس آئینے پر دے مارا، اور پھر اسکی کرچیاں اپنے ہاتھوں میں اُٹھا کر ان کی مدد سے اپنی آنکھیں، اپنے ہونٹ، اپنا چہرہ کھود کھود کر کھوجنے لگی۔

☆☆☆

حمام

سچل کی بانسری کی دُھن فضاء میں بکھر رہی تھی۔ ماحول مین بسا رومان دُونوں کے دِلوں کو گدگدار ہا تھا اور ملہار آنکھیں بند کیے اُس آواز کو اپنے دل کی دھڑکن میں سُمو رہی تھی۔ پھر سچل کی بانسری بند ہوگئی۔

تو ملہار نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اُسے ایسا لگا جیسے وہ ابھی ابھی دھرتی پر آئی ہے۔ وہ شاید آسانوں پر چاندستاروں کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ یہ کیفیت اس کے چہرے سے بھی عیاں تھی۔

''کیا ہوا؟''

سچل نے اُسے حیران وپریشان دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں! بس جب تم بانسری بجاتے ہو تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں آسمان پر چاندستاروں پر رقص کر رہی ہوں بالکل ایسے جیسے ہمارے تھر میں کبھی مور ناچا کرتے تھے۔ بابا نے مجھے بتایا ہے کہ جب کبھی گھنے بادل آسمان پر ڈیرے ڈالتے تو تھر کی زمین پر مور اپنے پر پھیلا دیتے پھر گھنگھور گھٹاوں کے برستے ہی مور بدمست ہو کر بے تا کان ناچتے۔ بارش کا برستا پانی انسانوں کے ساتھ ساتھ جانورں اور پودوں کے لیے زندگی کی نوید لے کر آتا اور جل تھل کر جاتا پورا تھر بارش سے نکھر کر کسی مصور کی پینٹنگ کا منظر پیش کرنے لگتا۔ مگر سچل اب بارش کیوں نہیں ہوتی؟

پھر خود ہی دوبارہ بولی!

''دیکھو تو زمین کسی پیاسے کے ہونٹوں کی طرح خشک ہو کر چٹکنے لگی ہے۔ درختوں کا

سایہ بھی کم ہوگیا ہے اب تو درختوں کی ٹہنیاں جھولوں کا وزن بھی نہیں سہہ پاتیں اور جانوروں کے پیٹ ان کی کمر سے جا لگے ہیں''۔

سچل اُسے پریشان نہ کرنا چاہتا تھا۔ کہ اماں نے اُسے کہا تھا کہ ان دنوں ملہار کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھوں کہ ماں بننے والی عورت کا خوش رہنا اس کے بچے پر اچھا اثر ڈالتا ہے۔ اس لیے اس کا خوش رہنا ضروری ہے۔

اسی لیے وہ اس سے یہ نہ کہہ سکا کہ

''یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ اب تو تھر کے گھروں پر موت کا سایہ منڈلا رہا ہے۔ ڈھور ڈنگر سب زندگی کی بازی ہارتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں جبھی تو اب بستی کے باہر والے درختوں پر گدھ آ کر بیٹھنے لگے ہیں۔ کہتے ہیں گدھ فضاء میں موت کی بو سونگھ لیتے ہیں اور پھر اسی سمت پرواز شروع کر دیتے ہیں جہاں موت اپنا رقص کرنے جا رہی ہو کہ جب موت کے رقص کی تھاپ پر سانسوں کی ڈور ٹوٹنے لگتی ہے تو گدھوں کو اپنی زندگی کی نوید سنائی دیتی ہے۔ ان کی آنکھیں سیرابی شکم کے تصور سے چمکنے لگتیں ہیں''۔

یہ سب باتیں کر کے وہ اُسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ملہار اُسے بہت عزیز تھی اُس نے بہت ضد کر کے اماں بابا کو اس سے شادی پر راضی کیا تھا اماں تو آسانی سے مان گئی تھی مگر بابا تو اُس وقت تک نہ مانا جب تک ملہار کے ماں باپ نے بدلے میں اُس کی بہن موہل کا رشتہ نہ لے لیا یوں وٹے سٹے کی بنیاد پر ہی سہی مگر اُس کی یک طرفہ محبت اُسے مل گئی۔

یک طرفہ اس لئے کہ سچل نے ملہار کو گاؤں کی ایک شادی میں دیکھا تو اُس کا اپنا دل اُسی کا اسیر ہو گیا۔ مشکل سے ہی سہی مگر اَب ملہار نہ صرف اس کی بیوی تھی بلکہ اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھی۔ اَماں بابا بہت خوش تھے اور اب وہ خود بھی اُس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

موہل بھی اپنے سسرال میں خوش تھی اللہ سائیں کی مہر سے اُس کا پاؤں بھی بھاری تھا۔ بستی میں نومولود کی آمد پر بستی کے بزرگ اللہ کا شکر ادا کرتے۔ بزرگ بابا نورالدین سب سے زیادہ خوشی کا اظہار کرتا وہ اُس روز جم کر بھنگڑا ڈالتا اور ایک ایک سے کہتا!

''دیکھو اللہ سائیں ابھی اپنے بندوں سے نا اُمید نہیں ہوا ہے جبھی تو اُس کی رحمت اور نعمت برس رہی ہے''۔

مگر بارش نہ ہونے کی وجہ سے بابا نورالدین آج کل آسمان کو گھنٹوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا

رہتا ہے۔ جب بھی کوئی جانور مر جاتا ہے تو کہتا ہے اسے بھی دفن کر دو ورنہ گدھ آ جائیں گے مردار کھانے ،ایک دن تو بخشو نے غصے میں کہہ بھی دیا کہ آنے دو انہیں اب ہمیں کیا ان مردہ جانوروں کو کوئی بھی کھائے کم از کم ان کا تو پیٹ بھرے گا۔تو بابا نوالدین نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور بولا !

'بھلا حرام سے بھی کبھی کسی کا پیٹ بھرا ہے بلکہ اس سے تو لالچ اور طمع کا گڑھا اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے تیزاب کی طرح یہ اندر ہی اندر سب کچھ جلاتا جاتا ہے نہ اب نہ ایسا بولنا ایک تو ہم پر بڑا وقت ہے۔ کہ ہماری زمین سوکھ رہی ہے،اور اس پر ایسی سوچ!

نہ، نہ کیا تم نہیں جانتے ؟ اِس کا تو سایہ بھی منحوس ہے جس پر پڑ جاتا ہے پھر وہ بھی حرام کو زندگی سمجھ لیتا ہے اور ہم تو اشراف المخلوقات ہیں ہم مردار کھانے کی تو اپنے دشمن کو بددُعا بھی نہیں دیتے''۔

بابا نورالدین کی باتیں سن کر سب خاموش ہو گئے کہ اِس کی عمر ہو چلی ہے۔اس عمر میں دماغ پھر جاتا ہے اور اکثر بندے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں ۔اکثر تو بابا نورالدین خود ہی او کھے سوکھے ہو کر سوکھی زمین کھود کر گڑا بنانے کی کوشش کرتا کہ مردہ جانور کو اس میں دفن کر سکے اور ساتھ ساتھ بڑبڑاتا بھی جاتا کہ!

''میں تمہیں مردار نہیں کھانے دوں گا میری بستی سے دور چلے جاو میں اپنے لوگوں پر تمھارا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا''۔

مگر کسی بھی مور کو دفنانے سے پہلے وہ ہولے ہولے اِس کے سب پر نکال لیتا اور شام کو مزار پر انھی پروں سے جھاڑ و دیتا اور دعا مانگتا کہ اللہ سائیں راضی ہو جائے۔

بابا نورالدین نے ہی بتایا تھا کہ موسم تو پہلے بھی سخت ہو جاتا تھا۔مگر لوگوں کا آپس میں خلوص و پیار دیکھ کر نرم پڑ جاتا تھا۔ جب تک کسی ایک بھی تھری کے گھر پانی کا ایک بھی گھونٹ ہوتا تو وہ بھی ہر ایک کا ہوتا تھا۔اب تو کوئی کسی کی آنکھ کے پانی کی وجہ بھی نہیں جاننا چاہتا شاہد اسی لئے موسم بھی ظالم ہو گیا ہے۔موسم بھی تو اللہ ہی کی مخلوق ہے نا! ظالم کا رنگ چڑھ گیا ہو گا پڑ گیا ہو اس پر ظلمت کا منحوس سایہ۔۔۔۔۔۔

موتل اپنے سسرال میں خوش تو تھی۔مگر جب اپنی بھابھی کے لئے اپنے بھائی کی والہانہ محبت دیکھتی تو دِل میں کسک محسوس کرتی کہ قاسم تو اُسے ایسا پیار نہیں کرتا۔اسی زیادہ کی چاہ میں کبھی،کبھی بدمزگی ہو جاتی مگر پھر آہستہ آہستہ سب معمول پر آ جاتا۔

مگر اس روز تو حد ہی ہوگئی رات جب وہ پانی پینے اُٹھی تو دیکھا قاسم اپنے بستر پر نہیں موہل نے قاسم کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگائیں دوڑائیں تو صحن سے ذرا پرے کونے میں نیم کے درخت کے پیچھے چاند کی چاندنی دو سائے بنا رہی تھی موہل اپنے دل میں ڈھیروں وسوسے لئے دبے پاوں اِس جانب بڑھی قریب پہنچ کر اوٹ میں ہی رُک گئی یہ آواز اُس کے سسر کی تھی جو قاسم سے کہہ رہے تھے!

''بس تو دل چھوٹا نہ کر تجھے نئی موٹر سائیکل مل جائے گی فیکا نائی بتا رہا تھا کہ اُس کی دکان پر ایم این اے کا منشی آیا تھا وہ بتا رہا کہ گورنمنٹ نے یہ اعلان کیا ہے کہ تھر کے ہسپتال میں سہولیات کی کمی کے باعث اگر زچگی کے دوران کوئی بچہ مر جائے گا تو اس کے وارثوں کو پچاس ہزار ملیں گے۔ بس تو اپنی بیوی کا نام اُسی ہسپتال میں لکھوا دے، اور ہاں جب اُس کو زچگی کے درد اُٹھیں تو ہسپتال لے جانے میں دیر کر دینا، بچہ پیٹ میں ہی مر جائے گا۔ تو تجھے پچاس ہزار مل جائیں گے تو ان پیسوں سے نئی موٹر سائیکل خرید لینا''۔

''مگر بابا میرا بچہ!''

قاسم نے مری ہوئی آواز میں پوچھا؟

''بچے کا کیا ہے؟ دوبارہ پیدا کر لینا تو جوان ہے''۔

باپ نے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا!

''اپنے دین محمد کو دیکھ اُس کے دو بچے آگے پیچھے بیمار ہو کر مر گئے۔ کیا ہوا صرف اخبار ٹی وی والے آئے خبر بنائی گنتی گنی کہ تھر میں مرنے والے بچوں کی تعداد اتنی ہوگئی ہے اور بس اللہ اللہ خیر صلہ، اب سنا ہے اس کی بیوی پھر اُمید سے ہے''۔

موہل سے اس سے زیادہ نہ سنا گیا وہ سن ہو کر رہ گئی مگر نجانے اُس میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ وہ چپ چاپ اپنی چار پائی پر آ کر بیٹھ گئی اور قاسم کے آنے سے پہلے سوتی بن گئی اُس کے دل میں طوفان اُٹھ رہے تھے اُسے اپنے ماں باپ بہت یاد آنے لگے رات نا جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح اُٹھی تو اُسی نیم کے درخت پر نظر جا ٹھہری اُسے ایسا لگا جیسے درخت کی چوٹی پر گدھ بیٹھا ہو جس کا سایہ اس کے آنگن پر پڑ رہا ہے۔

اُس نے ایک نئی ضد شروع کر دی کہ مجھے اپنے میکے جانا ہے رات میں نے اچھا خواب نہیں دیکھا۔

موہل کی ساس نے جب سُسر سے اُس کے میکے جانے کی اجازت مانگی تو سُسر نے بھی خوشی خوشی اجازت دے دی اور کہا

''ہاں ہاں ابھی لے جاؤ ملوا کے لے آنا اس کا جی بہل جائے گا''۔ پھر بیوی سے بولا اِس کی زچگی یہاں ہی اِس کے سسرال میں ہی ہوگی۔

موہل جب اپنے میکے آئی تو ملہار کے گلے لگ کر کچھ اِس لجاجت سے ضد کی کہ ملہار نے اپنے بھائی کو یہ کہہ کر اکیلا واپس بھیج دیا کہ ایک، دو، روز میں واپس بھیج دوں گی۔

اُس دن تو وہ اماں بابا سے کوئی بات نہ کر پائی کہ رات بھی جلدی ہی سو گئی تھی مگر صبح اُٹھی تو اماں اُسی کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اماں کچھ کہنا چاہ رہیں تھی مگر بات شروع نہ کر پا رہی تھی بس ابھی یہ ہی پوچھا تھا کہ واپس کب جاؤ گی کہ بابا نے آواز دے دی اور اماں اُٹھ کر چل دی۔

موہل نے سوچا مجھے اِسی وقت بات کر لینی چاہیے ابھی اماں بابا دونوں موجود ہیں، یہ سوچ کر ماں کے جاتے ہی وہ بھی یہ سب سوچ کر اماں پیچھے پیچھے چل دی۔ ابھی اماں بابا کے کمرے کے دروازے پر ہی پہنچی تھی کہ بابا کی آواز نے اس کے قدم وہاں ہی رک دیے وہ اس کی آمد سے بے خبر اماں سے کہہ رہا تھا!

''موہل کو اس کے گھر بھیج دو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ یہاں رُک جائے اور ملہار کو ہمیں اُس کے میکے بھیجنا پڑے زچگی کے لئے۔ پھر تو مجھ سے شکوہ نہ کرنا کہ میرا بیٹا شادی کے بعد مجھ سے دور ہو گیا ہے۔ اور میرے ہاتھ سے زمین بھی نکل جائے گی بڑے موقعے کی زمیں مل رہی ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ گورنمنٹ کہاں بار بار یہ اعلان کرتی ہے کہ زچگی کے دوران مرنے والی زچہ اور بچہ کے ورثہ کو دو لاکھ ملیں گے۔''

دروازہ

''اگر یہ فیکٹری بند ہوگئی تو کیا ہوگا؟''

حمید نے فکر مندی سے رشید سے پوچھا۔

''اللہ پر بھروسہ رکھو یہ اتنا آسان نہیں''۔

اِس سے پہلے رشید کوئی جواب دیتا، نذیر بول پڑا مگر فکر مندی اُس کے لہجے سے بھی عیاں تھی۔ پھر وہ تینوں خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔

آج کل روز، روز فیکٹری کے بند ہونے کی خبریں گردش کر رہیں تھیں۔ کھانے کے وقفے کے دوران صرف یہ ہی موضوع گفتگو کا حاصل رہتا۔ گھر سے لائے کھانے کے ڈبے کی طرح ان کی اپنی بھی بھوک پیاس ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اپنی اپنی جگہ ہر کوئی پریشان اور مضمحل تھا۔ خوش گمان مستقبل کے خواب کی جگہ فکر نے اپنا گھیرا اتنا تنگ کر رکھا تھا کہ نیند بھی ٹوٹ ٹوٹ کر آتی تھی۔

سب ہی اپنی مالی حیثیت سے اچھی طرح واقف تھے پھر فیکٹری سے تنخواہ ہی کتنی ملتی تھی کہ کچھ اچھے برے وقت کے لیے پس انداز کر لیتے۔ بلکہ اکثر تو مہینے کے آخر میں کسی سے اُدھار پیسے مانگنے پڑتے یا پھر گلی محلے کی پرچون کی دُوکان سے اُدھار سامان یعنی آمدن اٹھنی اور خرچہ روپیہ، ایسے میں بچت ایک ایسا لفظ بن کر رہ گیا تھا جیسے ایک غریب مزدور کبھی بھی اپنی زندگی کے جملے میں استعمال نہیں کر سکتا۔

رشید بھی دوسرے مزدوروں کی طرح اِس فیکٹری میں ایک معمولی مزدور ہی تھا۔ مگر وہ فیکٹری کے کام کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا کام بھی کرتا تھا۔ جس سے کچھ اضافی آمدن ہو جاتی تھی۔ وہ دیواروں پر اشتہاروں کی لکھائی کرتا تھا۔ اس نے یہ ہنر اپنے والد سے سیکھا تھا۔ اُس کے والد

فلموں کے بڑے بڑے سائین بورڈ بنایا کرتے تھے۔ایک زمانہ تھا جب سینما گھروں کے باہر حالیہ اور آنے والی فلم کے بڑے بڑے بورڈ آویزاں کیے جاتے تھے ان بورڈز پر جو تصویریں اور لکھائی کی جاتی تھی۔ وہ کسی کاریگر کی فنی صلاحیت ہوتی تھی۔ یہ لوگوں کا ذریعہ روزگار ہوتا تھا۔ پھر سینما گھروں کی جگہ مارکیٹیں اور رہائشی پلازہ بننے لگے۔ پھر اب تو پرنٹنگ یہ کا کام بھی مشینوں کے ذریعے ہونے لگا۔

مگر دیواروں پر لکھے جانے والے اشتہار آج بھی انسانی ہاتھوں ہی کے مرہون منت ہیں۔رشید نے اپنے بچپن میں اپنے والد کو یہ کام کرتے دیکھا تو اُنھی سے خوشخطی اور تھوڑی بہت مصوری سیکھ لی، میٹرک تک تعلیم بھی حاصل کی اور اُسے والد کے توسط ہی سے اِس فیکٹری میں ملازمت مل گئی۔ فیکٹری کی لگی بندھی تنخواہ سے گذر بسر ہو جاتی۔لیکن شادی کے بعد جب اخراجات میں بھی اضافہ ہوا تو اُس نے اپنے والد ہی سے سیکھے اِس ہنر کو بروکار لاتے ہوئے اضافی آمدن کا ذریعہ بنالیا۔ اس طرح اس کے حالات میں کچھ بہتری آگئی اور ضروریات کے پشتے میں بند بندھنے لگے۔

آہستہ آہستہ اُس نے ایک چھوٹا سا موبائل بھی خرید لیا تھا۔ موبائل خرید کر جہاں وہ بہت خوش تھا اُس کی بیوی جمیلہ اُتنی ہی ناراض تھی اُسے لگتا تھا رشید اب اُس کے حصے کا وقت موبائل کے ساتھ گزرتا ہے جب کہ رشید کے لیے اُس کا موبائل اُس کی جاگیر تھا۔

جب وہ بھی فیکٹری بند ہونے کی باتیں سنتا تو پریشان ہو جاتا کہ اب کیا ہوگا؟

رشید اور دوسرے مزدور اِس اب کیا ہوگا؟ کا ابھی کوئی حل نہیں نکال پائے تھے کہ ایک دن انھیں پتہ چلا کہ فیکٹری بِک گئی ہے، اور دوسرے مالک نے ان سب مزدورں کو فارغ کر دیا ہے۔ یہ اچانک افتاد ہر مزدور کے لیے جیتے جی مرنے کے مترادف تھی چنانچہ ہر کوئی ہی گھبرا گیا گو کہ افتاد سب پر ایک جیسی تھی مگر پریشانی سب کی جدا، جدا۔ ہر کوئی اپنے تہیں اپنے حالات سے نبرد آزما ہونے کی سوچ رہا تھا اور انھی میں رشید بھی تھا۔

رشید کے باورچی خانے کے ڈبوں کی گونج آہستہ آہستہ بڑھنے لگی، تو رشید نے سوچا دیواروں پر اشتہار پینٹ کرنے کے کام کو تیز کر دے مگر اُسے بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ تغیر کی آندھی سے اس کام میں بھی بہت کچھ بدل گیا ہے اب بلدیہ کی طرف سے دیواروں پر لکھنا گویا شہر کی دیواریں خراب کرنے کے مترادف ہے۔اس سے شہر کی خوبصورتی اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ اب

کھلے بندوں دیواروں پر لکھنا جرم کے زُمرے میں آتا تھا گو کہ یہ کام ابھی بھی جاری تھا، اُس کا مک مکا کہاں اور کیسے ہوتا، اِن سب سے رشید کو کوئی غرض نہ تھی اسے تو جب بھی کام مل جاتا وہ کر دیتا، اور اِس کی مزدوری نقد مل جاتی۔

رشید وہ سارے پیسے جوں کے توں جمیلہ کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ جن کو گن کر جمیلہ کی آنکھوں میں سوال اُبھر آتے مگر رشید نظریں چرا لیتا۔ وہ جانتا تھا کہ جمیلہ کی ضرورتوں کے عدد اور اس کے کمائے ہوئے پیسوں میں ہمیشہ راست تناسب ہی رہا ہے۔ اور پھر اب تو جمیلہ کی نظر رشید کے موبائل پر ٹکی تھی جب بھی کوئی ضرورت سامنے کھڑی نظر آنے لگتی تو وہ رشید سے موبائل بیچ دینے پر اصرار کرتی رشید کو اُس کی اِس بات پر بہت غصہ آتا اور اکثر بات بڑھ جاتی۔

پچھلے دو دن سے گھر میں کچھ نہیں پکا تھا صرف تھوڑا سا آٹا باقی تھا۔ جس کی روٹی بنالی گئی تھی اور تیز مرچوں کی چٹنی سے کھا کر گزارا ہو رہا تھا۔ غریب کے لیے مرچ کسی نعمت سے کم نہیں کہ کم سالن بھی مرچ کی زیادتی سے سب کے لیے پورا ہو جاتا ہے اور اس کی تلخی کو کم کرنے کے لیے پانی کا سہارا لینا پڑتا ہے تو پیٹ بھی خوب بھر جاتا۔

انھی مرچوں کی تلخی جمیلہ کی گفتگو میں در آئی اور وہ پھر سے رشید کو موبائل بیچنے کا کہنے لگی اب تو رشید میں جمیلہ سے بحث کرنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ اِسی لیے وہ گھر سے باہر نکل گیا شومی قسمت کہ اُسے دیوار پر لکھنے کو ایک اشتہار کا آڈر مل گیا۔

اب چونکہ یہ کام رات کے اندھیرے میں کرنا ہوتا ہے تو وہ یہ سوچ کر گھر سے باہر ہی بیٹھ گیا، کہ گھر جاؤں گا تو جمیلہ کا راگ پھر شروع ہو جائے گا کہ موبائل بیچ دو۔ اچھا ہے یہ سو جائے تو وہ گھر جا کر رنگ کا ڈبہ اور برش اُٹھا لے گا پھر جب کام ہو جائے گا تو وہ جمیلہ کو پیسے دے دے گا یوں اُس کا غصہ بھی کم ہو جائے گا۔ لے دے کہ ایک موبائل ہی تو ہے میں اِسے نہیں بیچوں گا اگر ایک بار بک گیا تو پھر کبھی دوبارہ نہیں خرید سکوں گا۔

اِسی اُدھیڑ بن میں وہ دیوار پر اشتہار کے الفاظ بھی لکھ رہا تھا۔ 'ہر قسم کی مشکلات کے حل کے لیے، گھریلو ناچاکی ہو یا کاروبار اور رشتوں میں بندش، بے روزگاری ہو یا پسند کی شادی، شوہر کا دوسری عورت کے چنگل میں پھنسنا یا ساس کے مظالم، محبوب کی بے وفائی ہو یا اولاد کا نہ ہونا، دشمن کی دشمنی، کالے جادو کے توڑ کے لیے ابھی رابطہ کریں... بابا موکل والا موبائل نمبر------'

کام ختم کرنے کے بعد رشید نے جا کر اپنا معاوضہ لیا اور گھر کی طرف چل دیا وہ خوش تھا

کہ اُس کا موبائل بج گیا۔

فیکٹری کے بند ہونے کی وجہ سے سویرے اُٹھنے کی کوئی جلدی نہ تھی اس لیے بےفکر ہو کر سو گیا۔

اس کی آنکھ موبائل کی گھنٹی پر ہی کھلی۔ جونہی اس نے موبائل اُٹھا کر ہیلو کہا!

دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز آئی!

'موکل والے بابا مجھے اپنے بے روزگار شوہر اور اپنی سونی گود کے لیے آپ کا تعویز چاہیے آپ کا ہدیہ کیا ہوگا؟'

صرف چند ہی لمحے بیتے کہ اچانک رشید کو ایک جھٹکا لگا اور موکل والے بابا اُس میں حلول کر گئے جو نسوانی آواز کو ہدیے کے عدد بتانے لگے۔

پانچویں بوتل

''اِس سردی میں تو یہ لحاف ساتھ نہ دیں سکیں گے نئے سرے سے اِن کی بھرائی کرانی ہوگی اور نئے کپڑے کا غلاف بھی بنانا ہوگا، پرانی روئی کی صفائی کروانی پڑے گی اور کچھ نئی خرید کر کمی کو پورا کرنا پڑے گا''۔

زرینہ پرانے لحاف کو دھوپ لگاتے ہوئے اپنے شوہر سے بولی!

ہوں ں ں۔۔۔

بشیر اُس کی بات سن بھی رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا مگر اپنی مالی خستگی سے باخبر تھا اسی لئے صرف ایک ہوں کر کے رہ گیا۔

زرینہ بھی بشیر کی اس ہوں کا مطلب اچھی طرح جانتی تھی مگر سردیوں کے موسم کا سر پر آجانے کا سوچ کر خاموش نہ رہ سکی اور پھر بولی!

''دیکھ بشیر سردیاں لحاف کے بنا نہیں گزریں سکیں گی۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا''

اور بشیر سوچ رہا تھا کہ ہم غریبوں کے لیے موسم کا بدلاؤ بھی ایک عذاب ہی ہے۔ ابھی پنڈا ایک موسم کا عادی ہوا نہیں کہ وہ بے وفا محبوب کی طرح بدل گیا اور دوسرا سفاک بن کر در آیا۔ سردیوں میں تو خرچہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ گرم کپڑوں کے ساتھ ساتھ گرم بستر، جلانے کے لئے لکڑیاں اور کوئلے کا خرچہ الگ اور اتنے دنوں سے فارم ہاوس میں کوئی مہمان بھی نہیں آیا ورنہ تنخواہ کے ساتھ ساتھ بخشش بھی مل جاتی جو اس طرح کے کاموں کی تکمیل کا مداوا بنتی۔

''اللہ سائیں سے دعا کر کہ کوئی مہمان ہی آجائے''۔ بشیر نے بیوی سے کہا! اور زرینہ جھولی اُٹھا کر فارم ہاوس میں مہمان آنے کی دعا کرنے لگی۔

بشیر اور زرینہ کی گذر بسر کا انحصار شہر سے دور بنے اِس فارم ہاوس کی ملازمت پر تھا۔ جہاں بشیر کے ذمہ فارم ہاوس کی چوکیداری، دیکھ بھال اور مہمانوں کی آمد پر اُن کی ضروریات کا خیال رکھنا تھا۔ جس کے عوض اُسے ماہانہ تنخواہ مل جاتی مگر اِس تنخواہ سے خریدے جانے والی چادر اُس کے قد کے برابر نہ ہو پاتی، کبھی سر تو کبھی پاؤں برہنہ ہو جاتے۔

اگر زرینہ صابر اور سگھڑ نہ ہوتی شاید زندگی بہت پہلے اُسے تھکا دیتی۔ اسی لیے زرینہ نے ایک گائے بھی پال رکھی تھی۔ جس کا دودھ آس پاس کی کچی بستی میں بیچ کر وہ کچھ آسانیاں خرید لیتے مگر پچھلی عید قرباں پر جب مالک کے بچے فارم ہاوس آئے تو اُن کی نظر اِس گائے پر ٹک گئی۔ غریب کی جیب جتنی تنگ ہوتی ہے، دل اُتنا ہی کشادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ بشیر نے اِسے بھی اعجاز جانا کہ اِس سے وابستہ کوئی چیز اِس کے مالک کو بھا گئی ہے۔ بشیر نے خوشی خوشی گائے ان کے حوالے کر دی۔

زرینہ کئی دن تک اپنی گائے کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہی۔ مگر جب اُن لمحوں کا سوچتی ، جب بشیر نے بڑے فخر سے اپنی گائے کی رسی مالک کے حوالے کی اور تفخر کا جو رنگ اُس کی ذات میں دیکھا تو اپنی قربانی بہت اَدنا لگتی نا لک نے گو کہ ایک رقم زبردستی بشیر کے ہاتھ پہ رکھی، مگر وہ دوسری گائے کی خریداری کے لیے ناکافی تھی، اور غریب کے گھر میں رکھی رقم میں نا جانے برکت کیوں اُٹھ جاتی ہے کہ آتی ہوئی تو نظر آتی ہے۔ مگر جاتی کہاں ہے یہ نہیں پتہ چلتا۔ اب بشیر کا ہاتھ پھر سے تنگ ہو گیا تھا البتہ یہ ضرور تھا کہ جب بھی فارم ہاوس میں مہمان آ کر ٹھہرتے تو جاتے وقت وہ بخشیش کی اضافی رقم بشیر کو ضرور دیتے اب یہ کبھی کم یا کبھی زیادہ ہوتی مگر بشیر کے سکھ کا سانس بنتی۔

زرینہ کی دعا قبول ہوئی اور فارم ہاوس میں ایک مہمان آیا۔ بشیر کو مالک نے فون کر کے اطلاع دی کہ فارم ہاوس تیار کر دو۔ آج میرا ایک دوست آ رہا ہے اور دیکھو اِن کا اچھے سے خیال رکھنا یہ کچھ دن ٹھہریں گے۔

''جی مالک!''

بشیر نے اَزلی سعادت مندی سے کہا اور یہ خوش خبری زرینہ کو سنانے چل دیا۔

شام تک وہ مہمان فارم ہاوس پہنچ گیا۔ اکیلے مہمان کو دیکھ کر بشیر کو بہت حیرت ہوئی اور تو اور جب اُس کا ڈرائیور بھی واپس جانے لگا تو اُسے رہا نہ گیا اور پوچھ ہی بیٹھا کہ صاحب اکیلے ہی

رہیں گے کیا؟، تو ڈرائیور نے اسے بتایا کہ صاحب کو اکیلے ہی رہنے کی عادت ہے۔

بشیر جب مہمان کے کمرے میں رات کے کھانے کا پوچھنے گیا تو دیکھا صاحب جی بیٹھے شراب نوشی کر رہے تھے پھر باتوں باتوں نے اُنھوں نے اپنی اُس خواہش کا ذکر بھی کر دیا جس کے لئے شراب نوشی کا اہتمام ہو رہا تھا۔

بشیر جانتا تھا کہ سب بڑے لوگوں کے شوق ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ شراب اور شراب کے ساتھ ایک ایسی جوان خوبصورت عورت کا ساتھ کہ اطاعت و فرمابرداری جس کے پیشے کا پہلا اُصول ہوتا ہے۔ اِسی لیے اُس نے نیلو کا نمبر سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ جو ایسے وقت میں آ کر بشیر کی مہمان نوازی پر دھبہ لگنے سے بچا لیتی۔

چنانچہ اُس روز بھی اُس نے نیلو کو بلا لیا۔ گو کہ ایسا کرتے اُسے بہت عجیب لگتا، تو وہ توبہ کرنے لگتا اور اُس رات اُس کی واحد پناہ گاہ زرینہ ہوتی۔

دوسرے دن وہ فارم ہاوس کا گارڈن عبور کر کے برآمدے ہی میں بیٹھ گیا کہ نیلو جب باہر آئے تو وہ پھر اندر جائے۔ کچھ دیر بعد نیلو اپنے پراندے سے کھلتی باہر نکلی اور ہاتھ میں پکڑے پیسے اپنے گریبان میں رکھتے ہوئے اک ادا سے بولی!

''تیرا یہ صاحب بہت عجیب ہے''۔

''کیوں کیا ہوا؟'' بشیر نے سوال کیا!

''بشیرے میں جسم فروش ہوں، میں نے ایسے بے غیرت اور کمینے مرد بھی دیکھے ہیں جو ایک داشتہ کے پیسے بھی کھا جاتے ہیں مگر تیرے صاحب نے بغیر محنت کیے ہی مزدوری دے دی ہے اپنی پوری زندگی میں، میں نے ایسا مرد نہیں دیکھا نیلو نے بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہوتے ہوئے کہا۔''

اب حیرت کے سمندر میں ڈوبنے کی باری بشیر کی تھی۔

'' اچھا! مگر ایسا کیوں؟''

''میں کیا جانو''

نیلو اٹھلا کے بولی اور کندھے اُچکائے پھر ایک بھرپور انگڑائی لی اور مسکراتے ہوئے چلی گئی۔

بشیر کو پورے دن کئی بار یہ خیال آیا مگر وہ جھٹک دیتا کہ ہوگی کوئی 'مجبوری'۔

پھر دوسری رات آئی۔مہمان نے پھر تقاضہ کیا اور بشیر نے پھر نیلو کو بلا بھیجا اور خود صبح کا انتظار کرنے لگا۔دوسرے دن نیلو نے پھر یہ ہی بتایا کہ آج بھی ہمارے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی مگر ہاں پیسے پورے دیئے جو طے ہوئے تھے بلکہ آج تو ٹپ بھی دی اور بشیر کو حیران چھوڑ کر اِتراتی ہوئی چل دی۔

بشیر اپنے آپ سے ہی اُلجھنے لگا کہ ایسا کیوں ہے دل ایک تاویل دیتا اور دماغ اس کو رد کر دیتا گو کہ یہ اِس کا مسئلہ نہ تھا اور نہ ہی اُس پر اثر انداز ہو رہا تھا مگر ایک عام بشر کی طرح بے وجہ ہی اُس کی وجہ ڈھونڈنے میں لگ گیا۔

دن بیتا اور تیسری رات آ گئی۔مہمان نے پھر خواہش ظاہر کی اور بشیر نے اس کی تعمیل کے لئے نیلو کو طلب کر لیا۔

آج اُس نے نیلو کو ایک پارکھی نظر سے جانچا۔نیلو ایک حسین اور مکمل عورت نظر آئی، جوان بدن کے ساتھ خود سپردگی کا تڑکا بھی پھر ایسا کیوں؟ اور سب سے بڑھ کر کہ اگر صاحب جی ایسے ویسے نہیں تو پھر کیوں وہ ایسی خواہش کا اظہار کرتے ہیں جس کا آخری سرا ایک ہی نتیجہ پر آ کر سوچ کے سارے در بند کر دیتا ہے۔

اُس رات اُسے نیند نہ آئی بشیر کو جاگتا دیکھ کر زرینہ نے پھر سے اپنی ضروریات کا لمبا چوڑا حساب اُسے بتانا شروع کر دیا۔مگر وہ ذہنی طور پر کہیں اور تھا زرینہ کی کوئی بھی بات وہ سن ہی نہیں رہا تھا زرینہ کبھی نیلو اور نیلو کبھی زرینہ نظر آتی۔اچانک اُسے ایک خیال آیا۔

صبح پھر نیلو سے سامنا ہوا تو نیلو نے ہنستے ہوئے اُسے انگوٹھا دیکھا کر نفی میں سر ہلا دیا اور اپنی ہنسی دبا کر جانے لگی مگر بشیر نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر رُوک لیا اور چپ چاپ دیکھنے لگا۔

گوری چٹی، بھرا، بھرا لُو دیتا بدن اور بڑی بڑی بے باک آنکھوں پر گھنی پلکوں کی چھالر

''تو کیا صاحب جی تجھے دیکھتے بھی نہیں''

بشیر کو جب کچھ بھی سمجھ نہ آیا تو پوچھ بیٹھا۔

''نہیں۔۔۔۔''نیلو نے کہا!

''اچھا! پھر کیا کرتے رہتے ہیں صاحب جی اور تو کیا کرتی ہے اِن کے کمرے میں؟''

بشیر کے لہجے میں تجسس تھا۔

''کچھ نہیں!''

نیلو نے بیزاری سے کہا۔

''پھر بھی؟''

بشیر نے کریدا۔

''کچھ نہیں بس صاحب جی روشنی کم کر کے غزلیں سنتے رہتے ہیں۔ہلکی آواز میں اور شراب پیتے رہتے ہیں کم کم پھر جب ان کی پوری بوتل ختم ہو جاتی ہے تو وہ میری جانب لڑکھڑاتے ہو بڑھتے ہیں اور بمشکل میرے قریب پہنچ کر وہاں ہی ڈھیر ہو جاتے ہیں۔پھر میں بھی سو جاتی ہوں صبح اِن کے اُٹھنے سے پہلے میں جاگ کر باہر آجاتی ہوں''۔

نیلو نے تفصیل بتائی۔

''تو تیری مزدوری؟''

بشیر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''وہ تو میں جیسے ہی کمرے میں جاتی ہوں وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں کہ میز پر رکھی ہے مگر میں بھی وہ پیسے صبح ہی اُٹھاتی ہوں جاتے ہوئے''۔

نیلو کے انداز میں ایک شان بے نیازی جھلک رہی تھی۔

''اُو اچھا!!!''

بشیر کے منہ سے نکلا۔

اُس دن دو پہر کے قریب صاحب جی نے بشیر سے کہا وہ باہر جا رہے ہیں شام تک لوٹ آئیں گے۔

اُن کے جانے کے بعد بشیر اُن کے کمرے میں گیا پہلے تو کمرے کی صفائی کی اس دوران اُسکی نظر شراب کی خالی بوتلوں پر پڑی بڑے سائز کی تین خالی بوتلیں وہاں ہی پڑی تھیں۔

بشیر بلا ارادہ ان بوتلوں کو اُٹھا کر پہلے دیکھنے اور پھر سونگھنے لگا ولایتی دارو کی خوشبو اُسے اچھی لگنے لگی وہ ایک بوتل کو منہ لگا کر چاٹنے لگا پھر دوسری اور پھر تیسری۔۔۔۔۔

کمزور پُشتے پر تیز بہاو کا پہلا وار ہی کافی ہوتا ہے اچانک بشیر کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

جب وہ گھر پہنچا تو زرینہ اپنے کاموں میں مشغول تھی۔وہ خاموشی سے زرینہ کو دیکھنے

لگا۔زرینہ کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ بشیر اُسے غور سے دیکھ رہا ہے تو اس نے اچانک پیٹھ موڑی اور بشیر کے سامنے ہو کر بولی

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

پھر نا جانے بشیر کو کیا سوجھی کہ اس نے زرینہ کو سب بتا دیا۔نیلو کا روز روز صاحب جی کے بلانے پر آنا اور صاحب جی کا بغیر کچھ کیے نیلو کو پیسے دے دینا۔

زرینہ کی آنکھیں یہ سب سن کر پھیلتی چلی گئیں۔وہ خاموشی سے سب سن رہی تھی اور حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہی تھی کہ بشیر نے ٹھہرے پانی میں پتھر پھینکتے ہوئے ایک دم کہا!

''کیا تو نیلو کی جگہ لے سکتی ہے؟''

زرینہ نے زور سے جھرجھری لی اور بے اختیار ناگواری سے بولی:

''نہیں۔۔۔''

خفگی اُس کے چہرے سے عیاں تھی۔مگر بشیر کے ذہن میں ولایتی، داور کی خوشبو ابھی تک رچی بسی تھی جبھی سمجھانے والے انداز میں بولا:

''دیکھ صاحب جی کچھ کرتے تھوڑی ہیں اور مفت میں پیسے دے دیتے ہیں ذرا دیکھ ہمارے کئی کام بن جائیں گے''۔

زرینہ خاموشی سے اِدھر سے اُٹھ گئی۔مگر بشیر کو اُس کی خاموشی میں رضامندی نظر آنے لگی۔

شام میں صاحب جی واپس لوٹ آئے تھے اور اُن کا ڈرائیور پھر واپس چلا گیا باتوں باتوں میں اُنھوں نے بتایا کہ وہ بس دو دن اور رکیں گے پھر چلے جائیں گے اور یہ بھی کہ وہ بشیر کی خدمت سے بہت خوش بھی ہیں اس خوشی پر بشیر کو انعام بھی دیں گے مگر بشیر تو کوئی اور ہی خواب دیکھ رہا تھا۔

بشیر جب وہ واپس آنے لگا تو صاحب جی نے پھر اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے متانت سے کہا

''بس دو دن اور تم میری خدمت کر دو''۔

بشیر نے حیرانگی سے صاحب جی کو دیکھا مگر کچھ پوچھ نہ سکا۔۔

گھر واپس آ کر اُس نے رزینہ کو سمجھانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اُس نے دیکھا زرینہ سر

پر دوپٹہ باندھے بازو ماتھے پر رکھے سو رہی تھی یہ زرینہ کی طرف سے احتجاج کا وہ انداز تھا جس سے بشیر باخوبی واقف تھا۔

سواُس نے پھر رات نیلو کو بلا بھیجا۔

آج نیلو بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ وہ شاید شام میں ہی نہائی تھی، جبھی اُس کے کھولے کھولے ہوا میں اُڑتے بال، نکھرا نکھرا سجا سنورا چہرہ، خود سپردگی کی دعوت دیتا وجود ذہن اور دل میں ہیجان برپا کر رہا تھا۔ بشیر نے جونہی نیلو کو دیکھا اس کے اپنے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی۔ اس بڑھتی دھڑکن کی تھاپ میں ایک خواہش جنم لی رہی تھی۔

اچانک اس نے نیلو کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نیلو نے کوئی مزاحمت نہیں کی مگر چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

بشیر کا پورا وجود سراپا خواہش بنا ہوا تھا اور نیلو جو ایک طوائف ہونے کے ناطے احساسات، جذبات اور جسم کی زبان بہت اچھے سے سمجھتی تھی بولی!

''دیکھ بشیر میں تو طوائف ہوں اپنے جسم کی بیوپاری پھر جو بھی چاہے خرید لے، ہمارے پیشے میں گاہک کا کوئی معیار نہیں ہوتا، بس وہ اِس کی قمت دینے کا اہل ہونا چاہیے، تجھے تو اچھی طرح معلوم ہے''

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ بشیر کے ہاتھ سے چھوڑا لیا۔

وہ جانتی تھی کہ غریب ضروریات کی قید سے ہی آزاد نہیں ہو پاتا عیاشی کے خواب کا تصور تو کر سکتا ہے مگر دیکھ کر تعبیر نہیں کر سکتا۔

بشیر کو نیلو کا اس طرح ہاتھ چھوڑانا اچھا نہ لگا، نیلو کے الفاظ نے اس کے اندر کے مرد کو جھنجوڑ دیا۔

''ہاں ہاں جانتا ہوں سب جانتا ہوں۔ مگر تو یہ بھی تو دیکھ کہ میں تجھے ہی پیش کرتا ہوں حالانکہ میرے پاس اور بھی ہیں تجھے تو اپنے دھندے کے سارے اُصول بھی معلوم ہونگے، کہ بیچ کے بندے کا کمشن بھی ہوتا ہے''

بشیر نے اندھیرے میں تیر چلایا جو صحیح نشانے پر لگا۔

نیلو نے اپنا لہجہ فوراً چاشنی میں ڈوبلیا اور بولی!

''تو اب تو بھی کمیشن لے گا۔ جیسے دوسرے دلال لیتے ہیں۔ تو نے یہ کام بھی شروع کر

دیا کیا؟''

بشیر کو نیلو کے منہ سے نکلے الفاظ ناگوار تو گزرے مگر خواہش کی تکمیل کا سر روانا پر پڑنے والی چوٹ سے سبقت لے گیا۔

''نہیں میں کمیشن نہیں مانگ رہا مگر احسان کا بدلہ ضرور لوں گا''۔

بشیر نے حتمی انداز میں کہا۔

نیلو سب سمجھ کر بھی نا سمجھنے کا تاثر دیتے ہوئے بولی!

''اب صاف صاف بول''۔

''تو صاف صاف بات یہ ہے کہ اپنے احسان کے بدلے میں، تو اپنی ایک رات دے دے اور کوئی کمیشن نہیں نہ ابھی نہ آئندہ''۔

بشیر نے کہا!

''منظور ہے''

یہ کہتے ہوئے نیلو نے لمبا سکون کا سانس لیا ورنہ اُسے اپنی کمائی میں کمیشن دینے کا سوچ کر ہی ہول اُٹھنے لگا تھا۔

''ابھی تو جا پھر جب میں کہوں تو آ جانا''

بشیر نے بشاشت بھرے لہجے میں کہا۔

جاتے جاتے بشیر نے نیلو کا ہاتھ پھر سے پکڑ لیا اور شان سے بولا

''دیکھ میں نے تو ایڈوانس میں حساب چکا دیا''۔

نیلو اپنا ہاتھ چھڑا کر صاحب جی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور بشیر اپنے گھر۔

زرینہ اُٹھ چکی تھی بشیر نے اُس کے ساتھ کھانا کھایا اور اُسے بتا دیا کہ نیلو صاحب جی کے پاس چلی گئی ہے زرینہ مطمین ہو گئی۔

بشیر نے زرینہ کو پھر سے تیار کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ اب وہ نیلو کے ساتھ گزارنے والی رات کے حسین خواب بھی دیکھ رہا تھا۔ اب اُسے زرینہ کی ناراضی کی کوئی پرواہ نہیں تھی کیونکہ اُسکا دل نیلو کے وصل کے خواب کی زد میں تھا، اور خواہش بھرے خواب تو ویسے بھی ایسے ان دیکھے پنکھ سے جوڑے ہوتے ہیں جن کی پرواز کی رسائی چاند ستاروں سے بھی آگے کسی ماورائی دنیا تک ہوتی ہے۔ پھر زرینہ کے لئے وہ یوں بھی مطمین تھا کہ صاحب جی تو بے ضرر ہیں اِن سے نقصان کا

کوئی اندیشہ ہی نہیں بلکہ فائدہ ہی فائدہ ہے۔

زرینہ نے جب خدا کا خوف یاد دلایا تو بشیر نے کہا!

''ارے جب صاحب جی کچھ کرتے ہی نہیں تو گناہ کیسا؟''

پھر زرینہ نے زمانے کی اونچ نیچ بتانا چاہی تو اُس نے یہ کہہ کر اُسے سمجھا دیا

''یہ بات بس ہم دونوں میں رہی رہے گی رہے صاحب جی تو وہ کون سا جانتے ہیں کہ تو کون ہے؟''

زرینہ بولی!

''دیکھ بشیرے یہ اپنی آنکھ کی شرم ہوتی ہے۔ اس کا پردہ اگر ایک بار اُتر جائے تو بڑی بربادی ہوتی ہے۔ شریف آدمی جب برائی کا رستہ اپناتا ہے تو اس کا نقصان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ پھر حرام کی کمائی کسی نشہ کی طرح ہوتی ہے جو عادت بنتی جاتی ہے''۔

مگر بشیر نے اپنی ہوس و خواہش کی تکمیل کے سنہرے خواب میں زرینہ کے خوف کے ہر رنگ کو پھیکا کر دیا۔

اُس رات ایک رشتے میں بندھے ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی بستر پر سونے والے دو لوگوں کے خوابوں کے رنگ مختلف تھے ایک کے خوابوں میں اندیشے، وسوسے، فکرات کے ناگ اور دوسرے کے خواب میں پریاں جنکے ہاتھ میں جادو کی چھڑی اور ہونٹوں پر ملن کے گیت تھے۔

اگلی صبح بشیر نے نیلو سے پھر پوچھا!

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں!''

پھر نیلو انگڑائی لیتے ہوئے بولی!

''پتہ نہیں صاحب جی کیسے ہیں؟''

''مگر میں ایسا نہیں''

بشیر نے اُسے یاد دلانے کے لئے کہا اور نیلو ہنستی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

کمرے کی صفائی کے دوران پھر ایک خالی بوتل بشیر نے اُٹھائی سونگھی اور لبوں سے چاٹنے لگا۔ صاحب جی اُٹھے اور غسل خانے چلے گئے۔ بشیر اِدھر اُدھر صفائی کرنے لگا اچانک اُس کی نظر شراب کی ایک بھری بوتل پر پڑی۔ پھر ایک خیال اُس کے ذہن میں آیا کہ آج رات نیلو میرے ساتھ ہوگی اگر میں تھوڑی سی شراب بھی چرالوں تو میرا مزا دوبالا ہو جائے گا۔ اِس خیال نے اُسے زیادہ نہ سوچنے دیا چنانچہ اُس نے نئی بوتل سے کچھ شراب خالی بوتل میں اُنڈیلی اور اِس کی کو پوار کرنے کے لیے اُس میں پانی ملا دیا، پھر اُسے اِس کی جگہ پر اُسی طرح رکھ دیا جیسے وہ پہلے رکھی تھی۔

آج بشیر کا دن ہی نہیں گزر رہا تھا اور شام آ کر دینے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی وہ کئی کئی بار رات کے بارے میں سوچ چکا تھا۔ اور تو اور وہ زرینہ کو بھی کچھ پیار اور کچھ سختی سے رضامند کروا چکا تھا۔

پل پل انتظار کے بعد رات آئی پہلے اُس نے بہت کوششوں سے سمجھا بجھا کو زرینہ کو صاحب جی کے کمرے میں بھیج دیا اور پھر اپنے خالی گھر آ کر نیلو کو بلا والیا۔

نیلو جب کمرے میں داخل ہوئی تو بشیر بیٹھا چوری کی شراب پی رہا تھا۔ پھر نیلو نے بشیر کے احسان کی قیمت چکا دی۔ صبح بشیر کا اُٹھنے کو جی نہ چاہ رہا تھا کچھ شراب اور کچھ نیلو کا خمار ابھی بھی باقی تھا مگر زرینہ کے آنے سے پہلے اُسے نیلو کو گھر بھیجنا تھا۔ تاکہ دونوں ہی بے خبر رہیں اور پھر اُسے زرینہ کا انتظار بھی تھا۔ نیلو تو اِس وقت تک آ جاتی تھی۔ مگر زرینہ کیوں نہیں آئی۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ زرینہ عجیب سی حالت میں گھر میں داخل ہوئی۔ زرینہ کی وہی حالت تھی جس حالت میں نیلو یہاں سے گئی تھی بشیر کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی۔

وہ ایک دم آگ بگولہ ہو گیا اور بے تاب ہو کر زرینہ کی طرف بڑھا مگر اس کے قریب جا کر رُک گیا۔

اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ پچھلے کئی دن سے نیلو کو دیکھ رہا تھا تو کیا نیلو جھوٹ بولا کرتی تھی یا زرینہ نے خود کو ہی پیش کر دیا اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اُس نے آگے بڑھ کر زرینہ کے بال پکڑ لیے اور دوسرا ہاتھ اُسے مارنے کے لیے ہوا میں بلند ہوا۔

وہ چیخ چیخ کر زرینہ سے سوال کرنے لگا!

'بول ایسا کیسے ہوا؟

زرینہ نے سراسیمگی کی حالت میں اُسے بتایا کہ مجھے تو خود نہیں معلوم بس جب میں کمرے میں گئی تو صاحب جی شراب پی رہے تھے اور موسیقی سن رہے تھے پھر جب اُن کی شراب ختم ہوگئی تو وہ مجھے دیکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھے اور چل کر میرے پاس آئے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولے

''آج پتہ نہیں شراب نے مجھے ہوش سے بے گانہ کیوں نہیں کیا حالانکہ آج بھی میں نے پوری بوتل پی ہے''۔

''اور پھر۔۔۔''

زرینہ سے آگے کچھ نہ بولا گیا۔ بشیر کی زرینہ کے بالوں پر گرفت ڈھلی ہوگئی اور ہوا میں بلند ہاتھ اُس کے اپنے ہی سر پر آگرا۔ وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔۔۔

اور

یہ بھی نہ دیکھ اور سن سکا کہ زرینہ کے ایک ہاتھ میں شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے اور لبوں پر جملہ ہے!

'بشیرے میں گائے نہیں'۔

☆☆☆

(نذر احمد ندیم قاسمی)

تجاوزات

''لو سنبھالو اپنے بچے کو اور آئندہ خیال رکھنا۔ یوں ہر ایک پر بھروسہ مت کر لیا کرو!''
نعمان نے گڈو کو اپنی بیوی فرزانہ کی گود میں دیتے ہوئے سمجھاتے ہوئے کہا۔

فرزانہ اپنے بچے کو یوں نعمان کے کندھے پر سر رکھے بے سدھ سوتا دیکھ کر حیران ہو گئی کیونکہ گڈو کو تو اس کی محلّہ دار نسرین یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے کر گئی تھی کہ اُسے بازار جانا ہے اکیلے جاتے ہوئے عجیب لگتا ہے اور پھر گود میں بچہ ہو تو لوگوں کی ایسی ویسی نظروں سے بھی بچت ہو جاتی ہے شاید لوگ صرف ماں کے روپ میں ہی عورت کو عزت کا حقدار سمجھتے ہیں۔

فرزانہ نے یہ سوچ کر کہ وہ بھی اِس فرصت میں اپنے دو چار کام نمٹا لے گی۔ بلا چوں چرا گڈو کو نسرین کے حوالے کر دیا اور پھر ایسا کوئی پہلی بار تھوڑی ہوا تھا۔ بلکہ نسرین تو اکثر گڈو کو اپنے ساتھ لے جاتی تھی اور اب تو گڈو بھی نسرین کے ساتھ مانوس ہو چکا تھا جونہی وہ نسرین کو دیکھتا اُس کے ساتھ جانے کو اپنی بانہیں پھیلا دیتا اور مانوس بھی کیوں نہ ہوتا کہ نسرین پورا پورا دن گڈو کو اپنے ساتھ رکھتی کھلاتی پلاتی پھر جب واپس لے کر آتی تو بسکٹ، ٹافیاں اور چپس بھی دے کر جاتی کبھی کبھی تو کوئی کھلونا بھی دلا دیتی۔

سو آج بھی جب نسرین گڈو کو لینے آئی تو فرزانہ نے اپنے بچے کو اِس کے ساتھ بھیج دیا اور خود گھر کے کاموں میں جٹ گئی۔ مگر کچھ ہی دیر کے بعد نعمان جو آفس گیا ہوا تھا بے وقت واپس آ گیا اور گڈو اس کی گود میں تھا۔ وہ بھی ایسے کہ اس کے کندھے پر سر رکھے بے سدھ سو رہا تھا۔

'یا اللہ خیر''!

فرزانہ گڈو کو یوں دیکھ کر اُن کی جانب لپکی۔

''اِسے کیا ہوا؟ اور یہ آپ کو کہاں سے مل گیا یہ تو نسرین کے ساتھ گیا تھا بلکہ نسرین اس کو بہت چاؤ سے ساتھ لی کر گئی تھی''۔

فرزانہ گڈو کو تھپ تھپاتی جاتی بول رہی تھی۔

''اسے سُلا دو، جب اِس کی نیند پوری ہوگئی تو یہ جاگ جائے گا۔ تمہیں کچھ معلوم ہے، نسرین اسے کہاں لے جاتی تھی؟''

نعمان نے فرزانہ سے پوچھا

فرزانہ نے نفی میں سر ہلا دیا مگر گڈو کے لیے پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

پھر نعمان نے فرزانہ کو بتایا کہ وہ آفس کے کسی کام سے جب اس بازار سے گزرا تو دیکھا بازار کے فٹ پاتھ پر گڈو ایک چادر پر بے سد پڑا ہے، اور ایک برقعہ پوش عورت اِس کے قریب سر جھکائے بیٹھی ہے عورت نے اپنا چہرہ بے شک بہت اچھے سے چھپا رکھا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ پاوں تو کھلے تھے جو کہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ اِس کی جواں عمری کو بھی ظاہر کر رہے تھے آس پاس سے گزرنے والے اِس کی پریشانی پر کم اور اِس کی خوبصورتی اور جوانی پر زیادہ توجہ دے رہے تھے جبھی اِس کے پاس سے گزرتے ہوئے مدد کی غرض سے کچھ روپے گڈو کی چادر پر رکھ جاتے اور کچھ تو رقم رکھتے ہوئے جس نظروں سے دیکھتے یا جو جملہ بولتے گویا یہ رقم اِن کے کسی نادیدہ جذبے کی تسکین کی قیمت ہے۔ مگر جب میرا گزر وہاں سے ہوا تو میں نے گڈو کو پہچان لیا پھر جب پولیس کے پاس جانے کی دھمکی دی تو تمہاری نسرین نے سب بتا دیا کہ کیسے وہ اِس معصوم کو کھانسی کی دوا زیادہ مقدار میں پلا کر بے سد کرتی ہے اور پھر کیسے گڈو کے ذریعے پیسے کماتی ہے۔ اب تم سمجھی نسرین ہمارے بچے کو کہاں اور کیوں لے جاتی تھی''۔

یہ سب سن کر فرزانہ کے ہوش اُڑ گئے اور وہ دوبارہ اپنے بچے کو پیار کرنے لگی۔

نعمان اور فرزانہ کو مضافات کے اِس محلے میں رہتے دو سال ہو چلے تھے محلے میں انھی جیسے غریب لوگ ہی آباد تھے۔ اِس سے پہلے فرزانہ اپنے سسرال میں سب کے ساتھ ہی رہتی تھی مگر شادی کے کچھ عرصے کے بعد ہی ساس بہو کے روایتی جھگڑے شروع ہو گئے اور آہستہ آہستہ اِن کی شدت بڑھنے لگی جس کی وجہ سے گھر کا ماحول بھی کشیدہ ہونے لگا تو فرزانہ نے نعمان سے الگ

رہنے کی فرمائش بھی شروع کر دی۔

پہلے پہل یہ ذکر کم کم ہوتا اور بات آئی گئی ہو جاتی پھر آہستہ آہستہ یہ خواہش ضرورت بننے لگی گڈو کی پیدائش کے بعد تو گویا ساتھ مل جل کر رہنا ناممکن لگنے لگا۔ اِس سے پہلے کہ کوئی ناخوشگوار واقع رونما ہوتا گھر میں نعمان سے چھوٹے بھائی فرقان کی شادی کی باتیں ہونے لگیں تو انہیں اپنی گرہستی الگ کرنے کی اجازت مل گئی۔

فرزانہ جہاں اِس بات سے بہت خوش تھی، نعمان وہاں کچھ پریشان سا دکھائی دیتا تھا کہ سب کے ساتھ رہتے تو بہت سے اخراجات کا پتہ ہی نہ چلتا تھا مگر الگ ہونے کی صورت میں سارے کے سارے اخراجات اِس کے ناتواں کندھوں پر آ پڑے تھے۔ شادی کے وقت اماں نے لاکھ سمجھایا تھا کہ کسی مناسب پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرو مگر نعمان نے اماں سے صاف کہہ دیا کہ اُسے بیوی سے نوکری نہیں کروانی اگر لڑکی پڑھی لکھی ہوگی تو کہیں نہ کہیں نوکری کرنے کی خواہش بھی اس کے اندر ہوگی چنانچہ میرے لیے تو کوئی ایسی لڑکی دیکھیں جو گھر کے کام کاج تو جانتی ہو مگر پڑھی لکھی نہ ہو۔ سو اماں نے فرزانہ کو نعمان کے لیے پسند کر لیا کہ فرزانہ گھر ہستی تو جانتی تھی مگر پڑھی لکھی نہ تھی۔

شروع شروع میں نعمان کو الگ ہو کر پریشانی تو ہوئی مگر کچھ ہی ماہ بعد فرزانہ نے بہت اچھے سے پورے گھر کے کام سنبھال لیے اور نعمان کی کم تنخواہ میں بھی سب کچھ بہت اچھے سے نمٹا دیتی نعمان کی اپنی تعلیم بھی واجبی سی ہی تھی جس کے بل بوتے وہ ایک دکان میں سیلز مین تھا۔ یہ اس کی بہت پرانی نوکری تھی۔ دکان کا مالک ایک اچھا آدمی تھا جبھی اُس نے ایک پرانی موٹر سائیکل بھی نعمان کو دے رکھی تھی۔

نعمان دن چڑھے بازار کھلنے کے وقت پر مارکیٹ آ جاتا اور پھر سارا دن یہیں دکان پر گزارتا عشاء کے وقت تک بازار بند ہوتا تو یہ بھی گھر کی جانب چل دیتا۔ گھر جاتا تو فرزانہ اِس کا انتظار کر رہی ہوتی۔ پھر جب تک وہ گڈو سے کھیلتا، فرزانہ رات کی روٹی پکا کر گرما گرم کھانا لگا دیتی دونوں مل کر کھانا کھاتے اور دن بھر کی باتیں کرتے اسی دوران گڈو سو جاتا پھر یہ دونوں بھی سو رہتے دوسرے دن پھر اسی طرح وقت کے پہیے میں گھومنے لگتے۔

مگر اس نئی حکومت نے تو آتے ہی تجاوزات کے خلاف ایک مہم کا آغاز شروع کر دیا۔ آئے دن مختلف علاقوں میں تجاوزات کو گرایا جانے لگا انہی تجاوزات میں وہ مارکیٹ بھی آتی

تھی جہاں نعمان کے سیٹھ کی دکان بھی تھی۔

پھر ایک دن اس مارکیٹ کو بھی مسمار کر دیا گیا۔ بغیر کسی دوسری جگہ دوکانوں کو شفٹ کیے، سب کچھ ختم ہو گیا۔ سیٹھ نے نعمان کو فارغ کر دیا نعمان بھی کیا کہتا وہ جانتا تھا کہ اِس میں سیٹھ کی کوئی غلطی نہیں مگر سیٹھ نے اِس کی پرانی نوکری کے عوض وہ موٹر سائیکل دے دی اور یہ بھی کہا کہ اگر حالات نے ساتھ دیا اور وہ دوبارہ دکان بنانے میں کامیاب ہوا تو اِسے پرانی ملازمت پر بحال کر دے گا مگر ابھی وہ کچھ نہیں کر سکتا۔

نعمان سوچنے لگا یہ باتیں وہ فرزانہ کو کیسے بتائے وہ نجانے کتنی پریشان ہو جائے یہاں اُسے اماں کی باتیں یاد آنے لگیں کہ کسی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرو اگر کوئی مشکل آ بھی جائے تو دونوں مل بانٹ کر گذارہ کر لینا مگر یہ اُس کی اپنی مرضی اور پسند تھی یہ سب سوچ کر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ فرزانہ کو کچھ نہیں بتائے گا بلکہ وہ اب دوسری نوکری ڈھونڈے گا جب مل جائے گی تو پھر بتا دے گا یہی سوچ کر وہ چپ رہا اور روز ہمیشہ ہی کی طرح گھر سے نکل جاتا اور ہر اُس جگہ جاتا جہاں اُسے نوکری ملنے کی آس ہوتی اسی تلاش کے دوران نسرین اور گڈو والا معاملہ سامنے آ گیا۔

وقت تھا کہ گذرتا جا رہا تھا اور نوکری مل ہی نہ رہی تھی بلکہ اب تو ہر کوئی کسی نہ کسی پریشانی میں گرا نظر آتا۔ اماں کے گھر گئے بھی کافی وقت ہو چلا تھا وہ جب سے الگ ہوئے تھے اکثر کبھی پندرہ دن یا مہینے میں ایک بار اماں کے گھر کا چکر لگا لیتے تھے مگر اپنی پریشانی میں وہ یہ سب بھی بھول بیٹھا تھا۔

نعمان کے سارے پیسے آہستہ آہستہ ختم ہو چکے تھے اب تو موٹر سائیکل میں پیٹرول کے بھی پیسے نہ تھے پھر اب تو موٹر سائیکل میں کچھ کام بھی نکل آیا تھا۔ نعمان کے جی میں آیا کہ وہ اِسے بیچ دے۔ مگر پھر یہ سوچ کر کہ اِیسے میں اِس کے کیا پیسے ملیں گے اور دوسرا یہ کہ اگر سیٹھ نے دوبارہ بلا لیا تو وہ کیا کہے گا کہ موٹر سائیکل کہاں گئی اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

ایسا لگتا تھا کہ سب راستے بند ہو چکے ہیں فرزانہ بھی چپ چپ تھی جیسے اُسے بھی کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کیونکہ اب وہ بھی فکرمند سی نظر آنے لگی تھی۔ نعمان نے ایک دو بار پوچھنا بھی چاہ کہ کیا بات ہے تو وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے پائی بلکہ تھکن کا بہانہ کر کے بات بنا گئی۔ شاید گڈو کو اکیلے سنبھالتے سنبھالتے تھک جاتی ہو گی نعمان یہ سوچ کر چپ ہو رہا۔

اُس دن نعمان نے کئی دنوں کے بعد اماں کے گھر جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو

فرزانہ نے انکار کر دیا کہ موٹر سائیکل تو خراب ہے میں بس میں نہیں جاوں گی تم اکیلے ہی چلے جاؤ۔

نعمان بھی جیسے تیار بیٹھا تھا فوراً بولا ہاں یہ ٹھیک رہے گا بلکہ میں ایسا کرتا ہوں گڈو کو بھی ساتھ ہی لے جاتا ہوں اماں اسے بہت یاد کر رہی ہونگی۔

دوسرے دن نعمان اماں کے گھر جانے کو تیار ہو گیا فرزانہ نے گڈو کو بھی تیار کر دیا۔

''چلو آج تم آرام کر لینا تمہاری تھکن بھی دور ہو جائے گی۔ ہم شام تک واپس آ جائیں گے''

نعمان نے جاتے ہوئے بیوی سے کہا۔

''ہاں ہاں ٹھیک ہے آرام سے آنا''

فرزانہ نے گڈو کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

نعمان اور گڈو کے جانے کے بعد فرزانہ نے جلدی جلدی گھر کے کام نمٹائے اور گھر سے نکل گئی۔۔۔۔۔

اب سہ پہر بھی ڈھلنے کے قریب تھی فرزانہ سپر مال میں شاپنگ کر رہی تھی جب اُس کی شاپنگ مکمل ہو گئی تو اُس کے ساتھی نے کہا!

''اس شاپنگ مال کے برابر کے ہسپتال میں میرا ایک دوست ایڈمیٹ ہے، ہم دونوں ہسپتال چلتے ہیں۔ میں گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے ہسپتال کے اندر چلا جاوں گا تم اس کے دوسرے گیٹ سے نکل کر رکشہ کر لینا وہاں بہت رکشہ مل جائیں گے تم آرام سے گھر پہنچ جاوگی''۔

ابھی وہ ہسپتال کے گیٹ سے باہر نکل کر رکشہ کے لیے نظریں دوڑا ہی رہی تھی کہ فٹ پاتھ پر چادر پر بے سدھ سوئے بچے پر نظر پڑی اس نے بھی ویسی سرخ رنگ کی نیکر اور چیک کی بشرٹ پہن رکھی تھی جیسی صبح اُس نے گڈو کو پہنائی تھی۔

اسی اثناء میں ایک رکشہ اِس کے پاس آ کر رُوکا تو وہ لپک کر اِس میں بیٹھ گی۔ جونہی رکشہ نے اپنی اسپیڈ بڑھائی تو درخت کی اُوٹ سے نعمان اور نسرین نکل آئے اور جاتے ہوئے رکشہ کے دھوئیں کو ہونقوں کی طرح دیکھنے لگے۔

☆☆☆

تین د

اُف میری زندگی! یہ کس قدر عجیب ہے جب بھی یہ لگنے لگتا ہے کہ اب زندگی میں سکون اور ٹھہرو آ گیا ہے تو یہ اُسی وقت ایک نئی کروٹ لے لیتی، اور ایک نیا باب کھل جاتا ہے۔ ہمیشہ تین د کی مثلث میرے مدِ مقابل ہی رہی پھر میں اپنی تمام عمر زندگی کو اس مثلث میں مقید کرنے کی سعی کرتی رہی۔

مگر۔۔۔

بچپن کی کچھ تلخ یادوں کی کرچیاں میری روح میں پیوست ہو کر رہ گئیں تھیں۔ یہ یادیں جب بھی اپنا سر اُٹھاتیں تو میرے سارے پرانے زخم ہرے ہو کر رسنے لگتے، غلط کہا جاتا ہے کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے انسان پتھر ہو جاتا ہے کاش میں پتھر ہی ہو جاتی مگر میں تو جب بھی مڑ کر دیکھتی تو اور بھی زیادہ لہولہان ہو جاتی۔

ابو ہمیشہ ہی غصے میں رہتے، اور اسی غصے میں بہت بے دردی سے ماں کو پیٹتے ماں کے جسم پر چوٹیں پڑتیں اور ان چوٹوں کے ردِعمل میں ماں کی چیخیں جب سفر کرتی ہوئیں میرے کانوں سے ٹکراتیں تو میری نیند اُڑ جاتی میں بھاگ کر ماں سے لپٹ جانا چاہتی، اُنھیں بچانا چاہتی، مگر اُن کے بیڈ روم کے دروازے پر جا کر رُک جاتی کیونکہ دروازہ اندر سے بند ہوتا میں چاہ کر بھی اندر نہ جا سکتی اور ابو کا خوف میرے ہاتھوں سے دستک کی طاقت بھی چھین لیتا مگر اندر سے مسلسل چیخنے اور رونے کی آوازیں باہر آتی رہتیں۔

اُف وہ کرب میں ڈوبی چیخیں، آہیں اور سسکیاں آج بھی ان کی بازگشت میری روح میں پیوست ہے جنھیں میں چاہ کر بھی نہیں بھول پاتی۔ میں ڈرتی رہتی اور اسی دروازے کے ساتھ

چپک کر بیٹھ جاتی، اندر ماں روتی رہتی اور باہر میں، پھر نہ جانے کب ماں کی سسکیاں اور آہیں نیند کی آغوش میں گم ہو جاتیں اور میں بھی وہیں بیٹھے بیٹھے سو جاتی۔

دوسرے دن کی صبح بہت عجیب ہوتی ماں سوجھی سوجھی آنکھوں سے ہمیں دیکھ کر مسکراتی مگر ماں کی وہ مسکراہٹ بہت عجیب لگتی اور پھر سارا دن جسم پر پڑے نیلے اور کالے دھبوں کو کبھی برف اور کبھی سکائی سے مٹانے کی کوشش کرتی رہتی ایسا کرتے ہوئے ماں کے منہ سے ایک سسکاری نکلتی اور وہ آنکھیں بند کر لیتی۔ میں چھپ چھپ کر ماں کو تکتی اور یہ جاننے کی کوشش کرتی کہ ماں آنکھیں کیوں بند کر لیتی ہے۔ اُس رات نیلے اور کالے دھبے مجھے خواب میں بھی ڈراتے رہتے۔

پھر ایک دن صبح صبح ماں کی چیخوں سے آنکھ کھلی حالانکہ اُس رات تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا مگر اُس رات کی صبح غیر معمولی تھی، ماں کا یوں بلک بلک کر رونا اور بین کرنا سب کچھ غیر معمولی تھا۔ میں ماں سے لپیٹ جانا چاہتی تھی اور میں لپیٹ گئی ماں نے مجھے زور سے بھینچ لیا تھا۔ پھر روتے روتے بولی آج تو یتیم ہو گئی، تیرے ابو ہمیں اکیلا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلے گئے اب وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔

میرا دل زور سے دھڑکا مگر مجھے ایک سکون اور خوشی کا احساس اپنے اندر اُترتا ہوا محسوس ہوا لیکن یہ کیا ابو تو وہیں بستر پر سو رہے تھے مجھے کچھ بھی سمجھ نہ آیا تو میں نے بھائی کی طرف دیکھا، بھائی بھی رو رہا تھا اُسی نے مجھے بتایا کہ ابو مر گئے ہیں اب یہ کبھی نہیں اُٹھیں گے یہ جان کر تو مجھے اور بھی خوشی ہوئی پھر ہمارے گھر بہت ساری خواتین جمع ہو گئیں سب ماں کو دلاسہ دے رہی تھیں کی اب تم ہی ان بچوں کی ماں بھی ہو اور باپ بھی، اب تم ان کا اور یہ تمہارا سہارا ہیں۔

جب بھی کوئی ماں سے کہتا کہ اب تم اکیلی رہ گئی ہو تو نجانے کیوں ایک سکون سا میرے اندر بھر جاتا میں بار بار ابو کو دیکھتی کہ کہیں یہ جاگ نہ جائے پھر سب ابو کو ایسے ہی بستر پر لیٹا لیٹا لے گئے تو میرے سارے ڈر میرے سارے خوف آہستہ آہستہ خود بخود ختم ہونے لگے۔ میں وہیں ماں کی ٹانگوں پر سر رکھے چاندنی پر ہی لیٹ گئی اور ایک پرسکون نیند سو گئی۔ آج میں بہت خوش جو تھی۔

اُس دن کے بعد میں نے کبھی ماں کی چیخیں نہیں سنی مگر میرے خوابوں میں وہ چیخیں کبھی کبھی سنائی دیتیں تو میں ڈر کر اُٹھ جاتی ایسے میں ماں مجھے اپنے سے لپٹا لیتیں اور میں پُرسکون ہو جاتی۔

اب میری زندگی پُرسکون ہوگئی تھی ماں نے عددت کے بعد ایک اسکول میں ملازمت کر لی اور ہمارے بڑے گھر کو پورشن میں تقسیم کر کے بڑا حصہ کرائے پر دے دیا، شام میں کچھ بچے ٹیوشن پڑھنے بھی آنے لگے، ہم ماں کے ساتھ ہی اسکول جاتے اور شام میں دوسرے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر ماں سے پڑھتے۔

بھائی مجھ سے بڑا تھا ماں ہم دونوں سے بہت پیار کرتیں تھیں مگر مجھے اب بھائی سے ڈر لگتا تھا کہ وہ اکثر میرے بال کھینچ لیتا یا کبھی مجھے تنگ کرتا تو مجھے اُس میں ابو نظر آنے لگتے، میں آنکھیں بند کر کے ماں میں پناہ ڈھونڈ لیتی۔

O

وقت اپنی چال چلتا رہا اور ہم بڑے ہوگئے میں ازل کی ڈرپوک اور بھائی لمبا چوڑا بالکل ابو کا ہم شکل۔ میری بھائی سے کبھی بھی دوستی نہ ہوسکی کیونکہ بھائی کے کھیل بھی مجھے ڈراتے تھے۔ وہ جب پینٹنگ پیلو کو پینچ کرتا تو میرے اندر کوئی ان دیکھا خوف پلنے لگتا ماں اکثر کہتیں کہ بھائی کے ساتھ وقت گزارا کرو مگر نجانے کیوں میری بھائی سے بن ہی نہ سکی۔

پھر بھائی پڑھنے باہر چلا گیا وہ بہت خوش تھا ماں بھی خوش تھیں مگر وہ اُداس بھی تھیں اور فکرمند بھی مگر میں بہت خوش تھی اب ماں صرف میری تھی، مگر یہ کیا اب ماں نے پھر سے دروازوں کو تالے لگانے شروع کر دیے تھے کہ ہم اکیلے ہیں، نجانے کیوں مجھے تالے بہت برے لگتے میرا جی چاہتا کہ کسی بھی دروازے پر کبھی کوئی تالا نہ ہو۔

میری تنہائی نے میری دوستی کتابوں سے کروا دی، کتابوں کی یہ دوستی مجھے میڈیکل میں لے آئی، جس دن مجھے ڈاکٹر کی ڈگری ملی تو میں نے ماں کو بہت خوش دیکھا۔ خوش تو میں بھی تھی مگر رات پھر وہی خواب آیا اور مجھے اُداس کر گیا۔

میں نے گائنی کو اپنا مستقبل چن لیا۔ درد میں ڈوبی عورتیں آتیں، کراہوں اور درد کی انتہاؤں پر پہنچ کر بچہ جنتی عورت سے مجھے خواہ مخواہ ہمدردی ہوجاتی، ڈلیوری کرواتے میں اُسے پیار کرتی تو میرا اپنا اسٹاف مجھے حیرت سے دیکھنے لگتا، مگر بہت سی باتیں میرے اختیار سے باہر تھیں۔

میں خوش تھی کہ میری زندگی میں سکون آ گیا ہے مگر ماں میرے لیے بہت فکرمند تھیں پھر جب اُنھوں نے اس کا اظہار مجھ سے کیا تو جیسے میرے سارے ڈر واپس آ گئے۔ میں نے ماں

سے کہا بھی کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔ مگر ماں اسے میری ایک پیار کرنے والی بیٹی کی فرمابرداری اور روائتی شرم سمجھیں۔ ایک دن ماں نے مجھے کچھ تصاویر دیکھائیں اور بتایا کہ یہ رشتے کے خواشمند ہیں میں دیکھ کر ماں کو اپنی پسند سے آگاہ کر دوں۔

اُس رات مجھے پھر وہی پرانا خواب آیا ماں کے جسم پر چوٹوں کے نیلے کالے دھبے گڈمڈ ہو کر اور بھی بھیانک نظر آرہے تھے اُس رات پھر نیند میں میرے کانوں میں ماں کی چیخیں سنائی دینے لگیں میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھی دوڑ کر ماں کے کمرے میں گئی شکر ہے ہے دروازہ لاک نہیں تھا میں ماں سے لپٹ گئی اُسی چھوٹی خوفزدہ بچی کی طرح جو مجھ میں آکر ٹھہر گئی تھی، ماں بھی حیران پریشان تھیں مگر مجھے پیار کرتیں رہیں۔

چند دن کے بعد مجھے ماں نے ایک سیکاٹرسٹ کے پاس چلنے کو کہا مجھے زارا ندیم جو خود ایک گائنا کالوجسٹ تھی اُسے۔

اُس دن مجھے ایک بار پھر زندگی میں بے سکونی کا احساس ہوا میں نے ماں سے کچھ وقت مانگا اور وعدہ کیا کہ میں خود آپ کو بتادوں گی کہ مجھے کس سے شادی کرنی ہے۔

پھر میں نے اپنا تجزیہ کرنا شروع کیا انٹرنیٹ پر کچھ سیکاٹرسٹ سے رابطے کیے کچھ اپنے بھروسہ مند کولیگ سے مشورے کیے تو اس نتیجہ پر پہنچی کہ مجھے بند دروازے اور طاقت سے خوف آتا ہے۔ اور یہ خوف میرے شعور میں ڈیرا ڈال کر ایسا بیٹھا ہے کہ میرا پورا وجود اس کے تابع ہو چکا ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میں ماں کو کیسے مطمئین کروں کہ ماں کا اطمینان اور خوشی ہی میری زندگی کا حاصل تھا۔

O

اُس دن بھی مجھے ہسپتال میں دیر ہو گئی تھی میں شام میں دیر سے گھر پہنچی ابھی میں داخل ہی ہوئی تھی کہ گاڈرن میں پھولوں کو پانی دیتے انکل جبار پر نظر پڑی۔ انکل جبار ہمارے کرائے دار تھے انکے دو بچے ہیں دونوں ہی باہر جا کر سیٹ ہو چکے ہیں بیوی کا انتقال ہو چکا تھا انکل پودوں کو پانی دے رہے تھے جونہی میں گیٹ سے اندر داخل ہوئی انکل جبار کو دیکھ کر ہائے کہا اور انھوں نے بھی خوش دلی سے ہیلو ڈاکٹر کہا!

پھر اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا میں بہت تھکی ہوئی تھی با دلِ ناخواستہ اُن کے

پاس پہنچ کر رُک گئی انھوں نے پانی کا پائپ ایک طرف رکھا سامنے کی جیب میں اڑسا ہوا رومال کھینچا، ہاتھ صاف کرتے ہوئے گارڈن میں رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے ان کی طرف بڑھے میں بھی ان کی سنگت میں چل کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی مگر وہ دوسری کرسی کو گھسیٹ کر بیٹھنے کے لیے میز سے دور کرنے لگے مگر شاید کرسی بھاری تھی جیسے وہ ہٹا نہ پا رہے تھے میں بے خیالی میں اُٹھی اور کرسی کو کھسکا دیا۔

جبار انکل کرسی پر ڈھہ سے گئے۔ وہ اپنی کسی رپورٹ کا تذکرہ کر رہے تھے جو اُنہوں نے حالیہ وقت میں کروائی تھی مگر میں تو کہیں اور تھی مجھے جبار انکل اچھے لگنے لگے کمزور سے لاغر سے میں نے ان کے ہاتھ سے رپورٹ لی اور اُنھیں تفصیل بتانے لگی وہ بہت غور سے مجھے سن رہے تھے۔ اُن کی رپورٹ کچھ خاص اچھی نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے وہ کچھ فکر مند نظر آنے لگے، تو مجھے اور بھی اچھے لگنے لگے۔ میں نے اچانک ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک اچھے ڈاکٹر کی طرح تسلی دینے لگی وہ بھی ممنون نظروں سے مجھے دیکھنے لگے اور بس۔ وہ شاید اسیر لمحے تھے میرا پاگل دل جن کے دام میں آ گیا کہ جبار انکل کے کمزور ہاتھ میری خواہش بننے لگے۔

پھر میری اکثر شامیں جب میری ہسپتال سے کال نہ ہوتی تو میں جبار انکل کے ساتھ گزارتی۔ جبار انکل سے جبار صاحب تک کا سفر طے ہونے کے بعد میں نے ماں کو آگاہ کر دیا کہ میں جبار صاحب سے شادی کروں گی۔ ماں حیرانگی سے مجھے دیکھ رہیں تھیں ان کے چہرے پر تاسف و فکر عیاں تھی۔

''تم اپنی اور اُن کی عمر کے فرق کو شاید بھول چکی ہو ستائیس اور ساٹھ میں آدھے سے بھی زیادہ کا فرق ہے۔''

ماں کے لہجہ میں تلخی در آئی تھی۔

''یہ میری خوشی ہے اور ویسے بھی میرے نزدیک ذہنی ہم آہنگی اہمیت رکھتی ہے عمریں نہیں''

میں چاہ کر بھی ماں سے یہ نہ کہہ سکی کہ میں نے چھپ چھپ کر آپ کو اکیلے ابو کی طرف سے ملنے والی چوٹوں پر برف رکھتے ہوئے دیکھا ہے ٹھنڈی یخ برف رکھتے ہوئے بھی جو سلگتی ہوئی سسکاری سنی ہے اس کی آگ آج بھی میرے اندر بکل مارے بیٹھی ہے۔ مجھے جبار صاحب کے کمزور ہاتھوں سے خوف نہیں آتا، البتہ اپنے ہم عمر سے شادی کر کے میں اس کی دہشت سے نہیں

مرنا چاہتی۔

تھوڑی مشکل تو ہوئی مگر ماں مان گئیں یوں میں زارا ندیم سے زارا جبار بن کر اپنے ہی گھر کے ایک پورشن سے دوسرے پورشن میں آ گئی۔ میری زندگی میں کچھ بھی نہ بدلا، وہی شب و روز اتنا ضرور تھا کہ اب میں جبار صاحب کی صحت کا خیال رکھنے لگی۔ جبار صاحب بھی مطمئن تھے، مگر ماں کی نظریں مجھے کھوجتی ہوئی محسوس ہوتیں، انھیں جب بھی موقع ملتا، وہ مجھے سمجھانے لگتیں۔

میری زندگی میں ابھی وہ سکون اور ٹھہراؤ نہیں آیا تھا جس کی میں متمنی تھی، بظاہر سب ٹھیک تھا۔ مگر ماں کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، آخر ایک دن انہیں موقع مل گیا اور انھوں نے مجھے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے اپنی ازدواجی زندگی کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنے خاندان کو آگے بڑھانا چاہیے۔ جبکہ جبار صاحب نے مجھے شادی سے پہلے ہی بہت دیانتداری سے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ میری اس طرح کی کسی خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکیں گے اور نہ ہی مجھے ایسی کوئی خواہش تھی۔ میں اپنی زندگی میں خوش بھی تھی اور مطمین بھی مگر ماں کو کون سمجھائے۔

ماں کے تقاضے بڑھنے لگے تھے۔ پھر وہی حربہ کہ مجھے اپنا چیک اپ کروانا چاہیے۔

''مما آپ کیوں بھول جاتیں ہیں کہ آپ کی بیٹی ایک گائنا کالوجسٹ ہے''۔

'پھر تم مجھے بتاتی کیوں نہیں کہ کمی کہاں ہے، مسئلہ کیا ہے؟ میں کچھ نہیں جانتی بس مرنے سے پہلے میری یہ خواہش پوری کر دو''

ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

جبار صاحب بھی اس پوری سچویشن کو جانچ رہے تھے مگر وہ بھی خاموش تھے اور میں بھی۔

O

ایک دن میرے کلینک میں ایک شادی شدہ جوڑا آیا جو اپنی فیملی کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ مگر کچھ طبی وجوہات کی بنا پر یہ ممکن نہ تھا۔ انھیں کسی نے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا مشورہ دیا تھا اور وہ اسی عمل سے گذرنا چاہتے تھے۔

اُن کا علاج کرتے کرتے میرے ذہن میں بھی یہ خیال جڑ پکڑ گیا، جبار صاحب کو اس

بابت جب اپنا اہم خیال بنانا چاہا تو وہ حیرت سے مجھے تکنے لگے گویا پوچھ رہے ہوں کیا یہ ممکن ہے؟

''بالکل ممکن ہے گو کہ ابھی ہمارا ملک اتنا ترقی یافتہ نہیں ہوا کہ اسپرم اور اووا بینک بنا سکیں مگر کچھ ترقی یافتہ ہسپتالوں میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی ممکن ہے''۔

ہمیشہ کی طرح جبار صاحب میری خوشی میں خوش ہو گئے اور نہ صرف مجھے اجازت دے دی بلکہ ہر، ہر لمحہ ہر، ہر ساعت اُن کا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہا۔ پھر ایک تکلیف دے عمل سے گزر کر میں ماں بن گئی۔

اِس تمام دورانیہ میں میری بس ایک ہی دعا تھی کہ میں بیٹی کی ماں بنوں، بیٹے کی نہیں۔

بیٹے کے خیال ہی سے ابو یاد آ جاتے اُن کے ہاتھ، وہ ہاتھ جو ماں کو چوٹیں دیتے تھے اور ماں کی درد میں ڈوبی چیخوں کی بازگشت گونج بن جاتی اور میری روح کے زخموں کے بخیے ایک ایک کر کے اُدھڑنے لگتے میرے سارے زخم پھر سے ہرے ہو جاتے۔

نرس نے جب میری بیٹی کو میری گود میں دیا اور میں نے پہلی بار اُسے دیکھا تو مجھے اُس پر بہت پیار آیا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ میں تو ماں تھی مگر جو بھی دیکھتا وہ یہی کہتا یہ تو کسی پرستان کی پری معلوم ہوتی ہے بس پھر ماں نے اس کا نام پری ہی رکھ دیا۔

پری کو پا کر ماں کے چہرے پر اطمینان چھا گیا اور وہ خوش ہو گئیں۔

ماہ و سال گزرے میں مطمئن ہو گئی کہ اب زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا ہے سب ٹھیک ہو گیا ہے کہ اچانک زندگی نے کروٹ بدلی!

جبار صاحب ایک رات ایسے سوئے کی صبح نہ جاگ سکے اُس دن ماں کے ساتھ ساتھ پری بھی بہت روئی اور زندگی پھر سے بے سکون ہو گئی۔ ایسے میں ماں کا سہارا بہت بڑا تھا، جنھوں نے پری کو سنبھالا مگر وہ اب پہلے سے زیادہ فکر مند نظر آنے لگیں۔

زندگی عجیب سی ہو گئی ماں نے پھر سے رات کو دروازوں پر تالے کنڈیاں چیک کرنا شروع کر دیں۔۔۔

ابھی میری عدت پوری ہوئی ہی تھی اور میں نے زندگی کے معمولات کے پنوں کو ترتیب دینا ہی شروع کیا ہی تھا کہ ماں نے میری دوسری شادی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ وہ تو بھائی کا فون آ گیا تو یہ تذکرہ ٹل گیا ورنہ نجانے یہ بحث کہاں جاتی۔

بھائی مسلسل ماں کو اپنے پاس بلانا چاہ رہا تھا۔ بلکہ جبار صاحب کے گزر جانے کے بعد

تو وہ یہ چاہ رہا تھا کہ ہم سب اس کے پاس ہی شفٹ ہو جائیں ماں ٹکڑوں میں بٹی بٹی دیکھائی دیتیں بھائی سے ملنے اور اُسے دیکھنے کی تڑپ ماں کی آنکھوں میں صاف دیکھائی دیتی تھی، مگر میرا اور پری کا اکیلا پن اُن کے انتظار کی راہ میں حائل ہو کر اُسے طویل کر رہا تھا۔ لیکن اب جبکہ بھائی نے ماں کے تمام کاغذات تیار کروا کے ٹکٹ کے ساتھ بھیج دیے تو ماں چاہ کر بھی انکار نہ کر سکیں اور جلد واپس آنے کا کہہ کر بھائی سے ملنے چلی گئیں۔

ماں کے جانے سے جہاں میں اُداس تھی، وئیں یہ سوچ کر مطمین بھی تھی کہ ماں کو بھی کچھ دن نئے ماحول میں بیٹے کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کو ملے گا جو یقیناً اُن کی صحت پر اچھا اثر ڈالے گا جبکہ واپس آنے کے بعد پھر سے ہمارے لیے پریشان ہونا شروع کر دیں گی۔ پری ماں کے جانے سے بہت اُداس تھی اِس بات کی مجھے بہت فکر تھی، اِسی لیے میں اس کا خاص خیال رکھ رہی تھی۔

O

شہر کے حالات آئے دن خراب رہتے، اسٹریٹ کرائم بہت بڑھ گئے تھے جس کی وجہ سے تمام ہی لوگ کسی نہ کسی اُلجھن کا شکار رہتے میڈیا بھی ان خبروں کو مزید مرچ مسالحہ لگا کر اپنی ریٹنگ بڑھانے میں مصروف تھا۔ یہ خبریں ماں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ اُن کا فون جب بھی آتا تو وہ بہت فکر مندی اور پریشانی کا اظہار کرتیں اور مجھے دوسری شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے کا کہتیں، میرے ساتھ ساتھ اب وہ پری کے لیے بھی فکر مند تھیں کہ دس سالہ بچی کو کوئی ایسا شخص باپ کی صورت میں ملے جو میرے ساتھ ساتھ اس کی حفاظت اور خوشیوں کا بھی ضامن رہے۔

اُس روز مجھے ٹی وی پر ایک ٹاک شو میں گائناکالوجسٹ ڈاکٹر کی حیثیت سے ایک خصوصی گفتگو کے لیے بلایا گیا۔ کیمرے کے سامنے جانے سے پہلے مجھے میک اپ کروانا تھا، جو کہ کیمرے کی ضرورت کے تحت ضروری تھا۔ چنانچہ میں بھی میک اپ کروانے لگی۔ لیکن اس دوران میں نے محسوس کیا کہ میرا میک اپ کرنے والی خاتون بہت زیادہ سگریٹ نوشی کر رہیں تھیں اور ان کی باڈی لینگویج ان کی حد درجہ پریشانی کا ثبوت دے رہی تھی مگر وہ اپنے فرائض منصبی انجام دینے پر مجبور تھیں اور پریشانی سے بھی پیچھا نہ چھوڑا پا رہی رئیں تھیں، خیر میرا میک اپ ہو گیا اور میں

پروگرام کے لیے اسٹوڈیو چلی گئیں۔

پروگرام ریکارڈ بھی ہو گیا۔اب مجھے واپس جانا تھا۔میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے اس میک اپ کو صاف کروایا جائے چنانچہ میں ایک بار پھر میک اپ روم میں تھی۔اپنا چہرہ صاف کراتے ہوئے بھی میری نظر جب ان خاتون پر پڑی تو بھی وہ مجھے پریشان دکھائی دیں۔میں نے ازرائے ہمدردی اِن خاتون سے پوچھ لیا کہ ''آپ بہت پریشان لگ رہی ہیں کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں''۔

اُن خاتون نے ایک گہرا سانس لیا اور میرا شکریہ ادا کیا پھر کہا

''میری مدد کوئی نہیں کر سکتا یہ پریشانی میری خود ساختہ ہے''۔

میرے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا،مگر شاید وہ کوئی ہمدرد پا کر اپنا دل کھول بیٹھی

''میری پریشانی میرا دوسرا شوہر ہے''

میں ابھی حیران ہی تھی کہ وہ بولی!

''میں نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد اپنے بزرگوں کے اصرار پر دوسری شادی تو کر لی مگر اب ذہنی اذیت میں ہوں کہ پہلے شوہر سے میری ایک بیٹی ہے جس کی عمر بیس سال ہے اور وہ اس وقت گھر میں اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ اکیلی ہے حالانکہ میرا دوسرا شوہر ایک اچھا آدمی ہے،مگر انجانے وسوسے اور خیال مجھے پریشان رکھتے ہیں۔میں دن بہ دن ڈپریشن کا شکار ہوتی جا رہی ہوں۔اگر وہ میری بیٹی کو بحیثیت باپ پیار کرنا بھی چاہے تو مجھے اچھا نہیں لگتا اور اگر نہ کرے تو بھی عجیب لگتا ہے،ہم زندگی میں رشتہ تو جلد بنا لیتے ہیں مگر انہیں تسلیم کرنے میں بہت وقت لگاتے ہیں اور کبھی کبھی تو تمام عمر ہی گزار دیتے ہیں رشتوں کو ان کے صحیح مقام نہیں دے پاتے''۔

پھر خاموش ہو کر خلاؤں میں گھورنے لگیں۔

کبھی کبھی الفاظ ساتھ ہی نہیں دیتے گونگے ہو جاتے ہیں۔میں بھی لفظوں کا گونگا پن محسوس کر رہی تھی پھر بھی اِس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر کچھ لمحے ہمت و حوصلہ کی حرارت خاموشی کی زبان میں منتقل کرنے لگی۔کچھ دیر بعد مسکرا کر آئندہ کے لیے اچھی تمناؤں کا کہہ کر وہاں سی چلی آئی مگر میری سوچ کو ایک نیا راستہ مل گیا اُس خاتون اور میرے حالات کچھ کچھ ملتے جلتے تھے تو کیا اگر میں شادی کر لوں گی تو پری کے بارے میں ایسے ہی تحفظات کا شکار رہوں گی۔

اس سوچ نے اپنے آہنی پنجے میرے ذہن میں گاڑھ دیے اس سے نکلنے کا ایک ہی

طریقہ ہے کہ میں دوسری شادی ہی نہ کروں اور ماں کو کسی بھی طرح سمجھا کر راضی کرلوں۔

کیا یہ آسان ہوگا۔ کیا ماں مان جائیں گئیں اور اگر نہیں مانی تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا ۔ایک عجیب سی صورتحال میرے سامنے آنے والی تھی، جو دن بہ دن میرے قریب تر ہورہی تھی ۔خیر جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا میں پہلے ہی سے سوچ، سوچ کر اپنی توانائی کیوں ضائع کروں میں اپنے مالک حقیقی سے سچے دل سے دعا گو ہوگئی کہ مجھے کوئی راہ سوجھا دے۔ ماں جب بھی دیارِ غیر سے فون کرتیں میری اور پری کی خیریت معلوم کرتیں ڈھیروں نصیحتیں کرتیں اور دعائیں دیتیں۔

O

مجھے ایک سمینار میں شرکت کے لیے دوسرے شہر جانا تھا۔ دوسرے شہر کا فاصلہ زیادہ نہ تھا اور سمینار سر شام ہی اختتام پذیر بھی ہو جانا تھا اور میں اُسی دن اپنے شہر واپس آسکتی تھی گو کہ دیر ہونے کا اندیشہ ضرور تھا۔ خیر میں نے اپنی شرکت کو یقینی بنایا۔ اور اب میں واپسی کے لیے اپنے شہر کے ہائی وے پر تھی۔

سردیوں کی شام یوں بھی جلدی رات میں تبدیل ہو جاتی ہے مجھے اپنے گھر پہنچنے کی جلدی نے مستعدی سے گاڑی چلانے پر مجبور کیا ہوا تھا۔ ہائی وے اس وقت تقریباً سنسان تھی کہ اچانک میری نظر اپنے سے آگے ایک ڈبل کیبن پر پڑی جو تیزی سے مجھے اورٹیک کرتی ہوئی آگے نکلی اور آگے جا کر وہ تھوڑا سا سڑک سے ہٹ کر دائیں جانب چلتی رہی اور اچانک ایک گٹھری کو سڑک پر پھینک کر تیزی سے چل پڑی یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ میں بے دھانی میں اس کا نمبر بھی نہ نوٹ کر سکی۔ میری توجہ چونکہ مکمل طور پر اپنی ڈرائیونگ پر تھی اسی لیے جونہی میں اس گٹھری کے قریب پہنچی میں نے اپنی گاڑی سنبھال لی میں نے دیکھا وہ کوئی عورت تھی جیسے چلتی گاڑی سے نیچے پھینکا گیا تھا۔

پہلے میں نے سوچا کہ مجھے آگے بڑھ جانا چاہیے، مگر میرے ڈاکٹر ہونے نے مجھے رو کنے پر مجبور کردیا اور میں اس سے کچھ فاصلے پر رک گئی گاڑی سے اُتر کر دیکھا وہ عورت بے ہوش تھی ۔ ہائی وے سنسان تھا میں خود بھی کسی مشکل میں پھنس سکتی تھی مجھے جو بھی کرنا تھا فوری کرنا تھا چنانچہ میں اپنی گاڑی بالکل اس کے قریب لے آئی وہ بہت بھاری جسامت کی عورت تھی جیسے میں

نے بمشکل گھسٹ کر اپنی گاڑی میں ڈالا خدا کا شکر ہے وہ صرف بے ہوش تھی میں نے اسے پچھلی سیٹ پر لیٹا دیا اور فرسٹ ایڈ دی اور دوبارہ گاڑی چلانا شروع کر دی۔ اس سب کے دوران میں بڑی طرح تھک گئی تھی مگر یہ وقت یہ سب سوچنے کا نہ تھا۔

اب میرے سامنے دو سوال تھے کہ اسے کسی ہسپتال لے جاوں یا اپنے ہی گھر، میں کسی قسم کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتی تھی، پھر یوں بھی وہ ایک عورت ہونے کے ناطے میرے لیے قابل رحم ہو گئی تھی چنانچہ میں اُسے لے کر اپنے گھر آ گئی وہ عورت اب کراہ رہی تھی اور اس کے جسم کی طرح اُس کی آواز بھی بہت بھاری تھی۔ گھر پہنچ کر میں اُسے سہارا دے کر گھر میں گارڈن سے منسلک کمرے میں لے آئی یہ ایک طرح کا گیسٹ روم تھا جیسے جبار صاحب نے مہمانوں کے لیے خاص طور پر باغ میں بنوایا تھا کہ ہمارے مہمانوں کو ایک اچھا احساس ہو۔

لیکن یہ کیا؟

جب میں نے کمرے کی لائیٹ روشن کی تو مجھے حیرانگی کا جھٹکا لگا کہ جیسے میں عورت سمجھ رہی تھی وہ کوئی عورت نہ تھی بلکہ وہ ایک مخنس شخص تھا جو عورت کے لباس میں ملبوس تھا۔ ہائی وے پر کچھ تو اندھیرا اور کچھ پریشانی میں، میں سمجھ نہ پائی۔ خیر اب کیا ہو سکتا تھا، ابھی اُسے صرف علاج کی ضرورت تھی میں نے ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے پہلے بہت اچھے سے اُس کا معائنہ کیا اور اُسے دوائی کھلائی، جب وہ پرسکون ہو کر سو گیا تو میں اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

پری کو ملازمہ نے کھانا کھلا کر سلا دیا تھا اور خود بھی اُسی کے کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میرے پرانے ملازمین ایسے وقت میں مجھے کسی رحمت کی طرح محسوس ہوتے۔

دوسرے دن میں نے ہسپتال سے چھٹی لے لی تھی کہ رات جس مہمان کو میں سڑک سے اُٹھا کر لائی تھی اس کی موجودگی میں میں کیسے گھر سے باہر جا سکتی تھی۔ چند دن کی دیکھ بھال سے مہمان بالکل صحت یاب ہو گیا اب میں منتظر تھی کہ وہ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائے۔

پھر اُس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک نامکمل وجود لے کر اس بے رحم دنیا میں آیا تو اس کے اپنوں نے اسے اپنانے سے انکار کر دیا۔ زندگی نے اُس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شاخ سے بچھڑے پتے کے ساتھ ہوائیں کرتیں ہیں، وقت کے تھپڑے سہتے سہتے ناجانے کہاں کہاں سے گزر کر وہ یہاں تک پہنچا۔ وہ اپنی زندگی سے اِس حد تک بے زار ہو گیا تھا کہ اُس نے کئی بار بھاگ کر موت سے گلے لگنے کی کوشش کی مگر وہ اِس میں بھی ناکام ہی رہا اور موت اُسے زندگی کی گود میں

ڈال کر دور کھڑی ہو جاتی ۔ اِس رات کے واقع نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ اِس کی سانسوں کی ڈور بہت مضبوط ہے، ایک جھٹکے سے نہیں ٹوٹے گی، بلکہ ایک ایک سانس لے لے کر اپنے اختتام کو پہنچے گی ۔ وہ میرا شکر گذار بھی تھا کہ میں نے ایسے میں اُس کی مدد کی ،مگر آئندہ زندگی کا اُس کے پاس کوئی بھی منصوبہ نہ تھا۔ لیکن میرے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

مجھے اُس کے اِس حلیے میں چھپا ایک ہنڈسم مرد نظر آ رہا تھا۔ ہنڈسم مگر نا مکمل کمزور اور بے بس۔ بالکل میری پسند کا مرد۔ جس کی کوئی دہشت نہیں جس سے کوئی خوف نہیں نہ مجھے اور نہ ہی میری بیٹی کو۔

پھر میں ایک سنگ تراش کی طرح اِسے تراشنے لگی آہستہ آہستہ اُس کی ذہن سازی کا عمل بھی شروع کر دیا اور اپنا صنم بنانے میں کامیاب ہوگئی۔

اُسے میں نے بہت کچھ سکھایا مگر دنیا کے خوف کا پرندہ اِس کے دل کے پنجرے میں قید ہی رہنے دیا۔ اپنی پناہ کو اُس کی بقاء بنا کر ایسا پروگرام اُس کے ذہن کی ڈسک پر فیڈ کیا کہ ریحانہ سے ریحان بن کر بھی وہ میری کمانڈ کی زد میں رہا۔

آہستہ آہستہ وہ بھی اِس ماحول کا عادی ہونے لگا اُسے بھی یہ احساس ہونے لگا کہ اِس کا تحفظ اور سکون اِسی گھر میں ہے۔ دنیا کے تھپیڑوں سے اِسی چار دیواری میں پناہ ہے۔۔ سکون اور اچھی خوراک نے ریحان پر اپنا اثر ڈالا۔

جب ماں آئیں تو میں دنیا اور اُن کی نظر میں زارہ ریحان بن چکی تھی۔ ریحان چونکہ میرا ہی ہم عمر تھا تو اکثر لوگ اِس اچانک شادی کو میری پرانی گمشدہ محبت سے تعبیر کرنے لگے کبھی کبھی قیاس آرائیاں بھی مسکراہٹوں کو جنم دیتیں ہیں، سو میں بھی مسکرا دیتی تو لوگوں کا شک پختہ ہونے لگتا۔

جب ماں نے ایک دن مجھ سے پوچھا کہ ریحان کے بارے میں، میں نے اِن سے پہلے کبھی کوئی تذکرہ کیوں نہ کیا تو میرے پاس سوائے سر جھکانے کے کوئی دوسرا جواب نہ تھا، میری خاموشی میں ریحان کا راز پنہاں تھا اور ماں کے سامنے میرا بھرم بھی۔

میری خاموشی سے ماں کیا سمجھی یہ میرے لیے اہم نہ تھا میرے لیے تو اپنی ماں کے چہرے کا وہ اطمینان اہم تھا جو مجھے ماں کے پیاری آنکھوں سے اُمڈتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

ریحان، پری سے بھی بہت محبت کرتے ہیں، پری بھی اِن سے مانوس ہوگئی ہے اِن دونوں کی پکی دوستی دیکھ کر بھی میرے خوف و وسوسے سر نہیں اُٹھاتے۔ میں بھی مطمئن ہوں۔مگر میں آج بھی تین د کی مثلث سے باہر ہی ہوں۔

تین ' د '

یعنی

دین

دنیا

اور

دل۔۔۔۔

☆☆☆

اسیری

’مما میں کبیر سے ہی شادی کروں گی مجھے اُس سے محبت ہے‘ سوہا نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

’’میں کوئی فضول بات نہیں سننا چاہتی تمہاری شادی وہیں ہوگی جہاں میں بہتر سمجھوں گی۔ اپنی بڑی بہنوں کو دیکھو کتنی خوش ہیں اپنے، اپنے گھر، والدین کے فیصلے ہی اولاد کے حق میں بہترین ہوتے ہیں‘‘

رابعہ نے دوٹوک بات کرتے ہوئے کہا اور اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

محبت، محبت، محبت اُسے آج تک اِس لفظ کا نہ تو مفہوم سمجھ میں آیا اور نہ ہی اِس کا احساس ہوا! مگر یہ لفظ محبت زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر اُس کے سامنے تن کر آ کھڑا ضرور ہوتا کہ شاید اُسے اسکی پہچان ہو جائے مگر اسکی اپنی زندگی میں ایسا کبھی کچھ بھی نہ ہوا اور اب تو اس کا امکان بھی ختم ہو چلا تھا کہ اپنے چار بچوں کی نہ صرف پرورش پوری کر چکی تھی بلکہ تین بچوں کے گھر بھی بسا چکی تھی۔ بس اپنی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی سوہا کی ڈولی اُٹھوانی باقی تھی لیکن سوہا تھی کہ محبت کا راگ الاپ رہی تھی رُو، رُو کر آنکھیں سوجالیں تھیں کہ ذیشان سے شادی نہ کروں گی۔

ذیشان کا رشتہ بڑی آپا کے توسط سے آیا تھا خاندان اور لڑکا دونوں ہی دیکھے بھالے تھے لیکن سوہا کسی بھی طور اس رشتے کے لیے راضی نہ تھی کبھی بھوک ہڑتال تو کبھی بے جا کا رونا دھونا اور ان سب کی وجہ تھی اس کا کلاس فیلو کبیر۔

سوہا میڈیکل کے آخری سال میں تھی اور کبیر بھی اس کے ساتھ ہی اپنی پڑھائی مکمل کر رہا تھا۔ دونوں میں نجانے کب یہ احساس بیدار ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اپنی

پوری زندگی ہنسی خوشی بسر کر سکتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہوا تو زندگی اُن کے لئے ایک سزا بن جائے گی۔

وقت اور حالات نے اُن کی سوچ کو پختگی بخشی اور اب وہ کسی بھی دوسرے کو اپنے درمیان جگہ دینے کو تیار نہ تھے۔ اسی لئے جب سوہا کے سامنے ذیشان کا رشتہ رکھا گیا۔ تو اُس نے بے بلا سوچے سمجھے اپنی ماں کو ایک دم ہی جواب دے دیا کہ وہ ذیشان سے ہر گز شادی نہ کرے گی بلکہ وہ کبیر سے محبت کرتی ہے اور کبیر ہی اس کی زندگی کا ساتھی بنے گا۔

سوہا بار بار کبیر سے ملنے کو کہہ رہی تھی کہ آپ ایک بار کبیر سے مل تو لیں پھر آپ خود فیصلہ کیجیے گا کہ میری پسند کسی بھی لحاظ سے ذیشان سے کم نہیں تعلیمی، خاندانی، صورت وسیرت کسی بھی طرح کا کوئی جھول ایسا نہیں کہ جو ٹھکرانے پر اُکسائے اور پھر سب سے بڑی یہ بات ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔

مگر رابعہ کو ایک یہی بات سمجھ نہ آئی تھی کہ وہ اتنا بڑا اور اتنا اہم فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں اور محبت کو تو اُس نے کبھی بھی ایک وقتی جذبے سے زیادہ نہ سمجھا تھا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی کو دیکھو اور بس اُس کی محبت میں پاگل ہو جاؤ آپ کا اپنے آپ پر ہی اختیار نہ رہے، پھر اُس کے بغیر زندگی خالی خالی لگے۔ ہر شے اُس کے بناء اپنی اہمیت کھو دے، اپنا آپ ہی بے وقعت لگنے لگے دل، دماغ اُسے سوچے، اُسے ہی چاہئے، اُسے ہی مانگے ساری کی ساری خواہشات کی پرواز اُس تک محدود ہو جائے اُس کا ساتھ تکمیل بن جائے اُس کے ہونے کا احساس سارے خوش رنگ جذبوں میں حیات سمو دے، خود کو پنکھ لگ جائیں اور وقت اُس کے ساتھ میں ٹھہر جائے۔

ناممکن!

اس کے بعد رابعہ پھر اپنے آپ سے اُلجھنے لگی اپنی پوری زندگی کو پارکھی نظر سے دوبارہ دیکھنے لگی۔ گھر میں وہ سب سے چھوٹی تھی دو بڑے بھائی اور ایک بڑی بہن اُس کے ساتھ زندگی کے ہم قدم تھے بڑی بہن اپنے گھر بار کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھیں بڑے دونوں بھائیوں کی بھی شادیاں ہو چکی تھیں اور اماں آج کل اُس کے لئے رشتہ دیکھ رہیں تھیں کہ ایک دن اِس کی سہیلی نے اُسے بتایا کہ اُسے اپنے کزن سے محبت ہو گئی ہے کچھ ہی دن میں اُس کی والدہ یعنی ممانی جان رشتہ لے کر ہمارے گھر آ گئیں۔ اُس وقت اِس کی سہیلی کے چہرے کا رنگ دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ عام سے نقوش کی لڑکی کسی اپسراء سے کم نہیں لگ رہی تھی محبت کے سارے رنگوں نے اُسے صنم جو بنا دیا تھا۔ تب رابعہ کو محسوس ہوا کہ اچھا محبت ایسی ہوتی ہے۔ اتنی دلکش اتنی مسحور کن

اُس نے بے اختیار لیلیٰ سے پوچھا

''محبت ہوتی کیسے ہے؟''

لیلیٰ نے مسکرا کر ایک شان بے نیازی سے کہا

''معلوم نہیں مگر کہتے ہیں یہ اچانک ہی ہو جاتی ہے ایک دم چھن سے''

رابعہ نے اُسی وقت دعا مانگی

''کاش اُسے بھی محبت ہو جائے ایک دم چھن سے''

پھر رابعہ نے بہت انتظار کیا مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا، حالانکہ وہ یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ اِس کے ساتھ لڑکے لڑکیاں پڑھتے تھے۔ پوائنٹ سے آتی جاتی تھی مگر کبھی بھی کچھ ایسا ویسا نہ ہوا۔ اس کے اپنے گروپ میں لڑکیوں کے علاوہ لڑکے بھی تھے جو ساتھ ساتھ پڑھتے، پریکٹیکل کرتے مگر وہ سب ایک دوسرے کو اچھا دوست سمجھتے اور بس۔

کوئی بھی اتفاق، حادثہ یا واقع ایسا نہ ہوا کہ محبت کا کوئی در کھلتا، کئی بار کتابوں اور نوٹس کا لین دین ہوا مگر کسی بھی کتاب میں کوئی رقعہ، کسی بھی نوٹس پہ کوئی اضافی لائن اس کے لئے نہ لکھی گئی۔

پوائنٹ میں آتے جاتے بارہا اس نے دوسروں کی کتابیں پکڑیں کئی بار اپنی کتابیں دوسروں کے حوالے کیں، مگر کبھی کوئی اپنی کتاب اِس کے پاس نہ بھولا اور نہ ہی اُس کی کوئی کتاب کسی دوسرے کے پاس رہی، کمبائین اسٹڈی بھی کی کینٹین بھی گئے پکنک بھی منائی مگر سب کچھ ٹھیک، ٹھیک ہوتا رہا اور یونیورسٹی کا دور مکمل ہوا۔

ابھی ایم ایس سی کا نتیجہ بھی نہ آیا تھا کہ اُس کی شادی کے کارڈ چھپ کر آ گئے اور پھر وہ رابعہ منظور سے رابعہ ندیم ہو گئی۔ ندیم ایک کم گو سنجیدہ سی شخصیت کے مالک تھے۔ ایک عجیب طرح کا ٹھہراؤ تھا جو ان کی ذات کا احاطہ کئے رہتا۔ اس سب کے باوجود انہوں نے رابعہ کا بہت خیال رکھا اُسے ان سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوئی اور دونوں زندگی کے اس نئے رخ کو اپناتے نبھاتے رواں دواں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

وہ اکثر آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرتی کہ اُسے لیلیٰ کے چہرے کا رنگ آج بھی یاد تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دنیا کے سارے جگنو اُس کی آنکھوں میں آ بستے، جب وہ تیمور کی باتیں کرتی تھی۔ ایک شریر سی شرمیلی کنواری مسکراہٹ ہونٹوں پر ڈیرہ جما لیتی اور پلکیں یوں

جھک جاتیں گویا تیمور کی نظریں اُسے چھو رہی ہیں۔ مگر آئینہ کب جھوٹ بولتا ہے وہ رابعہ کو سچ بتا دیتا کہ نہیں تیرا تو چہرہ آج بھی پھیکا ہے سپاٹ ہے ٹھہری ہوئی ندی کی مانند جس میں محبت کا کوئی کنکر نہیں گرا جو اس میں بھنور کے دائرے بناتا ایسے میں اُسے ایک کڑواہٹ کا احساس ہوتا جو اُس کی روح تک اُتر جاتا مگر بہت کچھ انسان کے اختیار سے بالاتر ہوتا ہے۔

یکے بعد دیگرے بچوں کی پیدائش نے جہاں اُس کی ذمہ داریاں بڑھادیں وئیں یہ احساس بھی دلایا کہ ایم ایس سی کی جوڈگری الماری کے دراز میں رکھی ہے اُسے کیش کرواؤ کیونکہ یہ وہ وقت ہے جب اس کا استعمال ضروری ہو گیا ہے ورنہ زندگی میں گھٹن بڑھ جائے گی چنانچہ ادویات کی ایک کمپنی میں اپنے تعلیمی معیار کے مطابق خدمات دے کر زیست کی آسانیاں خرید لیں۔ یہاں بھی اُس کے ساتھ کئی مرد کام کرتے تھے مگر سب اس کی بہت عزت کرتے وہ لوگ گھنٹوں ساتھ رہتے بڑے بڑے پروجیکٹ پر ڈسکشن کرتے۔ اندورن ملک اور بیرون ملک سفر بھی کرتے مگر کوئی حادثہ، کوئی واقع، کوئی اتفاق ایسا کچھ بھی نہ ہوا کہ چھن سے کچھ ہو جاتا اور وقت گزرتا رہا۔ اب تو اُس نے آئینے سے باتیں کرنا بھی چھوڑ دیں تھیں۔ اُسے اب یقین ہو چلا تھا وہ سب بے معنی باتیں تھیں جن کا کوئی وجود نہیں۔

وقت کے تغیر نے آہستہ آہستہ بچوں کی تعلیم و تربیت کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا تو دوسرا مرحلہ ان کے گھر بسانے کا تھا۔ بڑے بیٹے کی شادی کے وقت اُس نے بھی دبے دبے لفظوں میں اپنی پسند کا ذکر کیا تو رابعہ نے ایک نہ چلنے دی بلکہ اِن سب باتوں کو بے معنی قرار دے کر بے بنیاد کر دیا اور اِس کی شادی اپنی مرضی سے طے کر دی۔ ندیم ہمیشہ کی طرح صرف موجود ہوتے مگر اپنی رائے محفوظ رکھتے بلکہ جو کہا جاتا اُسے سنتے اور مان لیتے۔ بڑے بیٹے جواد نے جب اپنے باپ سے اپنے حق کے لئے بات کرنی چاہی تو بھی ندیم نے کچھ نہ کہا بلکہ جواد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خاموشی سے اُس کی طرف خالی خالی نگاہوں سے دیکھتے رہے اور پھر صرف یہ کہا کہ اپنی ماں کی بات مان لو اُس کے بعد وہاں سے چلے گئے۔

رابعہ نے جواد کی شادی اپنی مرضی سے کر تو دی مگر اُس کے دل میں خود بھی ایک چبھن کا احساس بڑھ گیا کہ اب جواد بھی ندیم کی طرح خاموش، کم گو اور سنجیدہ نظر آنے لگا۔

گھر میں بہو بھی آگئی اور اسکے بعد دونوں بیٹیوں کی شادیاں بھی بہت احسن طریقے سے انجام پا گئیں اپنی بیٹیوں کو رخصت کرتے ہوئے وہ بہت خوش تھی کہ ایک بڑا فریضہ بہت خوش

اسلوبی سے ادا ہو گیا۔ خوشی کا یہ رنگ اُسے ایک احساس تفخر دے رہا تھا۔ جو اُس کی شخصیت میں صاف نظر آ رہا تھا۔ وقتِ رخصت وہ بہت خوش دلی سے بچیوں کو تسلی دے رہی تھی۔ ان کی ہمت بڑھا رہی تھی اور آئندہ زندگی کے لئے نصیحتوں کے ساتھ ساتھ دعائیں دے رہی تھی کہ اس کی سمدن نے اُسے دیکھ کر ندیم سے کہا!

"آپ کی وائف بہت حوصلہ مند خاتون ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟"

ندیم نے کہا" ہاں رابعہ ایک پریکٹیکل خاتون ہیں"

وہ یہ سب سن رہی تھی اور خوش تھی۔

مگر سوہا نے اس کے تمام دلائل کے آگے بند ھ باندھ دیے تھے وہ اپنی ضد پر اٹل تھی کہ ذیشان سے شادی نہیں کرے گی بلکہ وہ کبیر سے شادی کرے گی کہ اُس سے محبت ہے۔

"سوہا یہ محبت وحبت کچھ نہیں تم میرا یقین کرو یہ سب فضول اور بے بنیاد باتیں ہیں ان کا کوئی وجود نہیں"

"مما میں نہیں جانتی میں بس کبیر سے ہی شادی کروں گی۔ پہلے آپ ایک بار اس سے مل تو لیں" سوہا نے التجائیہ انداز میں کہا

"اگر مجھے پھر بھی کبیر پسند نہ آیا تو" رابعہ نے پوچھا

"مما آپ اگر اُسے ناپسند کریں گی تو مجھے وجہ بھی بتائیں گی۔ پاپا آپ کو ہمیشہ ایک پریکٹیکل خاتون مانتے ہیں اسی ناطے ہم پریکٹیکل بات کریں گے"

سوہا نے اٹل ارادے سے کہا۔

"ٹھیک ہے تم کبیر کو گھر بلا لو میں اُس سے خود بات کروں گی"۔

رابعہ نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

سوہا خوش ہو گئی اور اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ رابعہ کو برسوں پہلے کی اپنی تتلی لیلی کا چہرہ یاد آ گیا کہ آج سوہا کا چہرہ بھی ایسے ہی دمک رہا تھا۔

اب رابعہ جان بوجھ کر کبیر سے ملاقات کے وقفے کو بڑھانے لگی کبھی یہ مصروفیت تو کبھی وہ مصروفیت کبھی یہ عذر تو کبھی وہ بہانہ مگر کب تک آخر ایک روز سوہا نے چھٹی والے دن صبح صبح کبیر کو بلا لیا۔ چھٹی کا دن تھا کسی کو کچھ بھی کرنے کی جلدی نہ تھی سو کسی صورت بچاؤ ممکن نہ تھا رابعہ کو کبیر سے ملنا ہی پڑا۔

باظاہر کبیر خوش شکل سلجھا ہوا نوجوان تھا تعلیمی معیار رابعہ کے سامنے تھا۔ کبیر رابعہ کے ہر سوال کا جواب بہت ادب اور ٹھہراو سے دے رہا تھا انداز گفتگو اس کی اعلیٰ پرورش کی نشاندہی بھی کرر ہا تھا کہ رابعہ نے بہت سوچ و بچار کے بعد کبیر سے کہا!

''کیا تمہارے گھر والوں کو اس رشتے پہ کوئی اعتراض تو نہ ہوگا بہتر ہے کہ پہلے آپ ان سے بات کرلو''۔

کبیر نے کہا'' میرے گھر والے میرے اور سوہا کے بارے میں جانتے ہیں انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے''۔

''بیٹا میں کیسے مان لوں کہ تم یہ بات پوری سچائی سے کہہ رہے ہو کیونکہ تمہاری عمر میں اکثر جذبات میں آ کر اس طرح کی باتیں کی جاتیں ہیں''

رابعہ کے لہجے سے روکھا پن چھلک رہا تھا۔

کبیر خاموش ہو گیا اور اُس نے رابعہ سے کوئی بحث نہیں کی اور کچھ دیر کے بعد اجازت لے کر چلا گیا۔ رابعہ کو اپنے اندیشے کا کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا تھا اسی لئے جب سوہا نے اس کی مرضی جاننی چاہی تو رابعہ نے کہا

''نہیں تمہاری شادی کبیر سے نہیں ہوسکتی کہ کبیر اپنے گھر والوں کی طرف سے مجھے مطمئن نہیں کر پایا اور شادی دو افراد کے درمیان نہیں بلکہ دو خاندانوں کے درمیان ہوتی ہے جبھی وہ نبھتی ہے اور سب خوش رہتے ہیں۔ سوہا خاموشی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی رابعہ نے سوچا کہ اُسے سوہا کو کچھ وقت دینا چاہئے تا کہ وہ نارمل ہو جائے پھر وہ ذیشان سے شادی کی بات آگے بڑھائے گی۔

اُس روز رابعہ اپنے آفس میں بیٹھی تھی کہ چپڑاسی نے ایک کارڈ دیتے ہوئے بتایا کہ یہ صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کارڈ کسی مل اونر مسٹر جبران علی خان کا تھا۔ جہاں تک اُس کا اندازہ تھا اِس کے ملنے والوں میں کوئی بھی اُس نام کا نہ تھا، اور نہ ہی اِس کی سوچ اُس کا ساتھ دے رہی تھی کہ یہ کون ہے؟ رابعہ اِس وقت کسی خاص کام میں مصروف نہ تھی چنانچہ اُس نے وزیٹر روم میں اِن صاحب کو بیٹھانے کا کہا اور کچھ لمحات کے بعد خود اُن سے ملنے کے لئے وزیٹر روم کی طرف چل دی۔

وہ جونہی وزیٹر روم میں داخل ہوئی تو ایک مسحور کن مدھم سی خوشبو نے اِس کا استقبال کیا

اُس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی جبران علی خان اپنی نشست سے کھڑے ہو گئے اور ایک خوبصورت بوکے ایک شاندار مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جھکا کر اپنا نام بتاتے ہوئے اُسے پیش کیا۔

کچھ جھجکتے ہوئے اُس نے وہ پھول اُن سے لیکر میز پر رکھتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اِن کے مدِ مقابل بیٹھ گئی۔ مگر یہ کیا اُس کا دل دھڑک، دھڑک کر اپنے ہونے کا احساس دلانے لگا۔ اُس نے اجنبی نگاہوں سے جبران علی خان کی طرف دیکھا تو وہ اِن کی پُراثر شخصیت کے حصار میں کھونے لگی اور بے ساختہ کہا

''میں نے آپ کو پہچانا نہیں''

''یقیناً آپ نے مجھے نہیں پہچانا ہوگا کیونکہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے اور میرا تعارف یہ ہے کہ میں کبیر کا والد ہوں''

جبران علی خان نے شائستگی سے کہا۔

''اوتو آپ کبیر کے والد ہیں''

بے اختیار اس کے منہ سے یہ جملہ ادا ہوا۔

''جی کبیر میرا بیٹا ہے'' جبران علی نے مسکرا کر کہا۔

رابعہ کو کچھ سمجھ نہ آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے آج اِس کا دل و دماغ اِس کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔ وہ سمجھی شاید اُسے ہارٹ اٹیک آنے والا ہے، کہ عمر کے اِس زینے پر دل کا اِس طرح زور زور سے دھڑکنا یہ ہی احساس دلاتا ہے۔ اِس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بہترین اخلاقیات کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا

''پہلے آپ یہ بتایئے آپ کیا لیں گے چائے، کافی یا کچھ ٹھنڈا؟''

''پلیز کسی بھی قسم کے تکلف میں مت پڑیئے بہت شکریہ''۔ جبران علی نے کہا

''نہیں میرے خیال میں تکلف کا مظاہرہ تو آپ کر رہے ہیں آپ پلیز بتایئے''

رابعہ نے پھر پوچھا۔

''پھر ایسا ہے کہ جو آپ کا جی چاہئے''

اب مسکراہٹ گہری تھی۔

رابعہ نے بیل بجا کر پیئون کو کافی لانے کا کہا۔

رابعہ کو کچھ سمجھ نہ آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کی جائے، جبران علی نے اِس کی

مشکل خود ہی آسان کر دی اور کہا!

''میرے آنے کا مقصد سوہا آپ کی بیٹی اور کبیر میرے بیٹے کی آئندہ زندگی کے متعلق بات کرنے کا ہے مجھ تک آپ کے اندیشے اور خدشات پہنچ چکے ہیں اور میں انہیں صحیح سمجھتا ہوں۔ اس لئے اِس بات کی ضمانت دینے حاضر ہوا ہوں، کہ آپ اطمینان رکھیں میرے بیٹے کی پسند میرے لئے قابلِ عزت، قابل تحسین اور قابل راحت ہوگی۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی بیٹی کی خوشیوں کی حفاظت کا ذمہ میرا ہے مجھے اپنے بیٹے کی پرورش پر پورا بھروسہ ہے ہم دونوں میاں بیوی نے اپنے اکلوتے بیٹے کی پرورش محبت کے خمیر سے کی ہے وہ صرف محبت کرنا اور محبت دینا جانتا ہے ہمارے گھر میں آپ کی بیٹی کو بہت محبت واحترام ملے گا بیٹے کی صورت میں کبیر خدا تعالیٰ نے ہمیں بخشا ہے اور بیٹی کی صورت میں سوہا ہم آپ سے مانگتے ہیں۔سوہا آپ کی بیٹی ہے اس لئے آپ کو مکمل اختیار ہے کہ اپنا ہر طرح سے اطمینان کر لیں''۔

پیئون نے کافی ٹیبل پر رکھ دی تھی۔جبران علی نے بہت اطمینان سے کافی پی شکریہ ادا کیا اور چلے گئے۔رابعہ اِن کے جانے کے بعد بھی وہاں ہی بیٹھی رہی جبران علی کے جاتے ہی اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا کچھ کھو گیا ہے ایک عجیب سا خالی پن اُس میں در آیا۔ایک بے دم اور نڈھال کر دینے والی تھکن کا احساس ہوا جیسے وہ کوئی بہت لمبی مسافت بلا مقصد طے کرتی رہی ہو۔

پورے دو دن اپنے روم میں بند رہی عجب بے قراری کا عالم تھا اُس کا اپنا دل اُس سے ناراض تھا دنیا، رشتے، ناطے اور زیست کے اس دوراہے پر اپنے دل کا یہ ہرجائی پن اُسے بے کل کئے ہوئے تھا مگر عمر کے تجربے نے اُس سے فیصلہ کروا ہی لیا۔جبران علی کو فون کر کے سوہا کے رشتے کے لئے رضامندی دے دی۔

رابعہ ندیم جو ایک پریکٹیکل خاتون سمجھی اور جانی جاتیں تھیں۔جس نے اپنی دونوں بیٹیوں کی رخصتی پر ایک بھی آنسو نہ بہایا تھا۔اُسی پریکٹکل عورت کو تمام لوگوں نے سوہا کی رخصتی پر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھا۔۔۔

☆☆☆

بلَی

مرد شادی سے پہلے عورت کی جس خوبی سے متاثر ہوتا ہے شادی کے بعد سب سے پہلے اُسی پر روک لگا دیتا ہے۔

ارباز نے بھی میرا سے ضد کر کے شادی کی اور ضد بھی صرف اِس بات پر کہ ایک دن جب وہ اور اِن کے چند دوست گاؤں جاتے ہوئے رستے میں اپنی رائفل سے مرغابیوں کا شکار کر رہے تھے پھر جب ارباز اور اِن کے دوست شکار کی ہوئی مرغابیاں ہاتھوں میں اُٹھائے اپنی اپنی گاڑیوں کی جانب بڑھ رہے تھے کہ ایک تیز رفتار گاڑی دھول اُڑاتی اِن کے قریب سے زن سے گذر گئی۔ گاؤں جاتے راستے پر عموماً لوگ اتنی تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کرتے، یہی بات سب کو حیران کر گئی اِن سب نے اِس گاڑی کا پیچھا کیا مگر آگے جانے والی گاڑی اِن کی نظروں میں تو تھی مگر وہ اِس سے آگے نکلنا تو ایک طرف اِس کے برابر بھی نہ پہنچ پا رہے تھے۔ اِسی بھاگ دوڑ میں سفر مکمل ہوا اور گاؤں کی حدود شروع ہو گئیں اب آگے چلنے والی گاڑی کے ڈرائیور نے اپنی رفتار کم کر دی تھی مگر اب اِس تک پہنچنا گویا ایسا تھا جیسے اُسے ہنسنے کا موقع دینا اس لیے وہ سب اِس سے ذرا فاصلے پر ہی رہے لیکن دلی طور پر وہ اِسے جاننا چاہتے تھے۔

پھر اِن سب پر حیرت کے پہاڑ اُس وقت ٹوٹے جب وہ گاڑی گاؤں کے ماسٹر رب نواز کے گھر کے سامنے رُکی اور ایک لڑکی لمبی سفید چادر میں باہر نکلی اِس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور اپنا بیگ اور کتابیں اُٹھائیں گاڑی لاک کی اور گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

ارباز اور اُن کے دوست کچھ فاصلے پر رُک کے یہ سب دیکھ رہے تھے مگر ارباز نہ صرف دیکھ رہا تھا بلکہ کچھ سوچ بھی رہا تھا اسی سوچ کہ زیرِ اثر ارباز نے اپنی معلومات پوری کی اور ایک دن

بہت پیار سے دادی کے گھٹنے دابتے ہوئے اپنے دل کی بات بھی کہہ دی کہ انھیں ماسٹر رب نواز کی بیٹی میرا سے شادی کرنی ہے۔

دادی کا لاڈلہ کوئی خواہش کرے اور دادی پوری نہ کرے ایسا بھلا کیسے ممکن تھا دادی نے ارباز سے وعدہ کرلیا کہ ماسٹر رب نواز کی بیٹی ہی تیری دلہن بنے گی۔

پھر جب دادی نے دادا سے یہ کہا کہ دیکھیں چوہدری جی قدرت ہمارے حق میں فیصلہ دے رہی ہے بیٹا تو شہر میں جا بسا ہے اب اگر وہ بچوں کی شادیاں بھی شہر ہی میں کردے گا تو گاؤں سے رشتہ عید تہوار تک ہی محدود ہو جائے گا۔ اگر پوتا گاؤں میں شادی کرنا چاہتا ہے تو یہ ایک خوش آئین بات ہے ہمیں مان لینی چاہیے۔ یوں دونوں بزرگوں نے یہ سوچ کر کہ اس طرح اِن کی نسل کا اپنی زمین سے رشتہ مضبوط ہو جائے گا خوشی خوشی ہاں کردی اور اپنے بیٹے کو بھی اپنا فیصلہ سنا دیا کہ گاؤں کے ماسٹر رب نواز کی بیٹی میرا کو ہم نے ارباز کے لیے پسند کرلیا ہے تم بہو کو بتا دینا۔

اِس گھرانے میں ابھی تک فیصلوں کا اختیار بزرگوں کے پاس تھا جسکی پاسداری سب کے لیے لازم و ملزم تھی۔ کہنے کو شہر کے ایک پوش ایریا میں اِن کی رہائش ضرور تھی اور کاربار بھی شہر ہی میں تھا مگر اناج آج بھی گاؤں ہی سے آتا تھا اِسی اناج کی تاثیر تھی جو انہیں بار بار اپنی مٹی سے جوڑتی تھی۔

ارباز کے والد نے جب یہ خبر اپنی بیوی کو سنائی تو اُنھوں نے ناراضی کا اظہار کیا مگر یہ اظہار اِن کے اپنے شوہر اور اپنے بیڈروم تک ہی محدود رہا کہ اِن کے اختیار کی حد اِس سے زیادہ تھی بھی نہیں۔

ماسٹر رب نواز گاؤں کے اسکول کے ماسٹر تھے جن کی تنخواہ حویلی سے ادا کی جاتی تھی اور حویلی کے کھاتے دیکھتے تھے جن سے سال بھر کا اناج بھی مل جاتا تھا۔ ماسٹر رب نواز اور اس کا گھرانہ سادہ زندگی گزار رہا تھا دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی بیٹے پڑھ لکھ کر شہر میں نوکریاں کر رہے تھے۔ اور ان کا بسیرا بھی وہیں تھا۔

ماسٹر رب نواز اکثر حسرت و یاس سے خلا میں دیکھتے ہوئے کہتے نجانے کب تک ہم تعلیم کے نام پر اِسی ایک نامکمل اسکول پر اتفاء کریں گے۔ مگر اِس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے ہاں یہ ضرور تھا کہ انھوں نے اپنے تینوں بچوں کو تعلیم دلوائی بیٹے تو دوران تعلیم شہر میں ہوسٹل میں بھی رہے مگر میرا کو وہ ہوسٹل میں رہنے کی اجازت نہ دے پائے بلکہ میرا شہر میں اپنے بھائیوں کے گھر

رہتی اور ہفتہ وار چھٹی پر اپنے گاؤں آجاتی اسی لیے انھوں نے اپنے بیٹوں سے کہہ کر اسے ایک گاڑی بھی دلوادی اور ڈرائیونگ بھی سیکھادی یوں وہ خود ہی ڈرائیو کر کے گاؤں آجاتی اس دن بھی وہ گھر آرہی تھی جب ارباز کی نگاہوں میں بس گئی۔

ارباز اس کی تیز ڈرائیونگ سے متاثر ہو چکا تھا اُس ایک لمحے کی گرفت نے اُس کے ذہن کو جکڑ لیا تھا جیسے اِس نے محبت کا نام بھی دے دیا تھا۔

حالانکہ یہ مرد کی فطرت ہے کہ اُسے عورت کی ہر وہ خوبی کھلنے لگتی ہے جسے وہ زیر نہیں کر سکتا اس کا لاشعور بار بار اُسے اُس خوبی کی یاد دلاتا رہتا ہے جسے وہ محبت کا نام دے دیتا ہے۔

جبکہ یہ محبت نہیں یہ تو ایک طرح کی جنگ ہے ایک سرد جنگ جیسے وہ محبت کی آڑ میں جیتنا چاہتا ہے۔

دادی ماں نے ماسٹر رب نواز کی بیوی کو بلا بھیجا وہ بھی نائین کے ہاتھوں مٹھائی دے کر زمینداور کی حویلی سے بلاوا آنا گاؤں کے باسیوں کے لیے اپنے اندر خود ایک اعزاز ہے سو ماسٹر رب نواز کی بیوی سکینہ اپنا سب سے اچھا جوڑا پہن کے دادی کے پاس موجود تھی۔

پھر جب دادی ماں نے اپنا مدعا بیان کیا تو سکینہ سوچ میں پڑ گئی اور فوری طور پر کوئی جواب نہ دے پائی بلکہ اپنے شوہر سے مشورے اور اجازت کا وقت مانگا جس کی دادی نے بخوشی اجازت دے دی کہ وہ جانتی تھیں کی یہ لوگ کبھی بھی انکار نہیں کو سکیں گے بلکہ خوشی خوشی مان جائیں گے۔اور ہوا بھی یہی کہ سب کچھ بہ آسانی تہہ پا گیا اور چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا۔

شادی کے ابتدائی ایام میں سب کچھ ٹھیک طرح سے چلتا رہا۔ پہلا اختلاف اس دن ہوا جب شادی کے دو ہفتوں کے بعد میرا دوبارہ یونیورسٹی جانے کو تیار ہوئی تو ارباز نے اُسے نہ صرف یونیورسٹی جانے سے روک دیا بلکہ اپنا فیصلہ سنا دیا کہ اب تم آگے نہیں پڑھو گی۔ میرا کو بہت دکھ ہوا۔ اُس نے جب اِس پر بات کرنی چاہی تو ارباز نے مزید بحث کرنے سے منع کر دیا گویا یہ بات یہاں ہی ختم۔

اِس بار جب گاؤں گئی تو اُس نے بہت آہستگی سے ابا کو ارباز کا فیصلہ سنا دیا ایک لمحے کو ابا کا چہرہ متغیر تو ہوا مگر اپنی کیفیت پر قابو پا گئے اور بولے بیٹا تمہاری تربیت تو پوری ہوئی ہے نا اور تعلیم کی تو کوئی حد نہیں ہوتی ۔اب تمہیں اپنے شوہر کی بات مان کر ہی چلنا ہے، تم میرا مان ہو میرا غرور ہو اپنا گھر بساؤ، اپنے شوہر اور اس سے وابستہ لوگوں کو خوش رکھو، بیٹا تم عورت ہو جس کا ایک

جنم نہیں ہوتا تم ایک زندگی میں کئی بار جنم لیتی ہو اپنے بچوں کی صورت۔تمہارے جو خواب ادھورے رہ گئے ہیں انھیں اپنے بچوں کی اچھی تربیت سے پورے کر لینا' ابا نے اِس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو ایک سکون اُس کی ذات میں اُتر آیا۔وہ ابا کی نصحت میں ایک خواب لے کر آ گئی کہ میں اپنے بچوں کی بہت اچھے سے پرورش کروں گی۔

پھر ایک دن جب وہ گاڑی کی چابی اُٹھا کر جانے لگی تو ارباز نے منع کر دیا کہ اب تم گاڑی نہیں چلاؤ گی گھر میں ڈرائیور موجود ہے اِس کام کے لیے جن گھروں میں ڈرائیور نہیں ہوتا اُن گھروں کی خواتین گاڑی خود چلاتیں ہیں اِس بار اس نے خود ہی کوئی بحث نہیں کی۔

پھر آہستہ،آہستہ یہ نہ کرو، یوں نہ کرو،نہیں،نہیں ایسے نہیں،اس کی شخصیت کو ختم کرتے رہے اور وہ دھیرے، دھیرے مٹنے لگی۔ایک آدھ بار من نے بغاوت کی کہ یہ غلط ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے تو وہ اس شکوئے کو گرا میں باند لیتی اور جب گاؤں جاتی تو ماں کی گود میں سر رکھ کر ہولے ہولے ساری گرائیں کھول لیتی مگر ماں بھی تو اِسی ماحول کی صابر عورت تھی وہ بھی یہی کہتیں۔۔

''عورت جب تک موم رہتی ہے رشتوں کو برتی رہتی ہے جس دن لوہے کی مانند سخت بن کر تن کر کھڑی ہو جاتی ہے رشتوں کی قاتل بن جاتی ہے،موم بتی کو دیکھو کیسے اپنے سینے میں باتی کو پالتی ہے پھر اِسی باتی کے ایک سرے پر آگ جلا کر خود تو قطرہ قطرہ پگھلتی ہے مگر اپنے اطراف روشنی بکھیرے رکھتی ہے۔میری بچی موم ہی بنی رہ جیسے تمہارا مجازی خدا چاہتا ہے ویسے ہی ڈھلتی رہو۔موم بنی رہو گی تو ڈھلنا بھی آسان رہے گا،اگر لوہا بن گئی تو پہلے آگ اور پھر چوٹ ہی مقدر بن کر رہ جائے گی۔''

میرا سوچتی وہ موم بنے یا لوہا عورت کے مقدر میں نارسائی کا ہی دکھ ہے۔

شادی شدہ زندگی آگے بڑھی اور وہ ماں بن گئی ماں بن کر پرسکون ہو گئی اندر کی بغاوت کی آگ پر ممتا کے نرم چھینٹے پڑنے لگے تو وہ خود ہی سرد پڑ گئی۔اب وہ شانت تھی اتنی شانت کہ نہ اور نہیں کی کوئی لہر نہیں اُٹھتی تھی، سمجھوتے کی تہہ دار چادر کی بکل مارے اُداس آنکھوں سے مسکراتی رہتی۔

گاؤں سے شادی کا بلاوا آیا ہوا تھا سب کی شرکت ضروری تھی دونوں بچوں کی چھٹیاں بھی تھیں تو پوری فیملی گاؤں آ گئی، بچے نانا ابو کے ساتھ گاوں دیکھنے نکل گئے تو وہ اماں کے پاس آ بیٹھی۔اماں اس کے چہرے کو پڑھنے لگیں انہیں اس کے آس پاس محبت کی روشنی نظر آئی تو وہ سمجھ

گئیں کہ ان کی بیٹی نے اپنی دنیا بسالی ہے۔

بلال اس کا بڑا بیٹا جب گھر میں داخل ہوا تو بہت ایکسائیٹڈ ہو رہا تھا۔

''مما آپ کو پتہ ہے گاؤں کے لوگ بہت curl (ظالم) ہیں انھوں نے ایک cow (گائے) کو panish (سزا) کیا ہے۔سب لوگوں نے مل کر اِس کے گلے میں آئرن کی ایک بھاری bar (بلی) ڈال دی ہے اب وہ نہ تو بیٹھ سکتی ہے نہ ہی ہل سکتی ہے بے چاری کاؤ یہ کہہ کر وہ زور زور سے رونے لگا۔

ایسا گاؤں میں ہونا ایک عام بات ہے۔جب بھی کوئی جانور اپنی مان مانی کرے اور اپنے مالک کا کہانہ مانے تو گاؤں کے لوگ اسے اپنی زبان میں اتھرا کہتے ہیں چنانچہ اتھرے جانور کو مختلف طریقے سے سدھایا جاتا ہے اتھری گائے کے گلے میں لوہے کی ایک بھاری سیل ڈال دیتے ہیں جیسے عرفِ عام بلی کہتے ہیں یہ بلی وزن میں بہت بھاری ہوتی ہے جس کی وجہ سے اب گائے نہ تو اپنے مالک سے رسی چھوڑا کر بھاگ سکتی ہے اور نہ ہی کسی کو ٹکر یا ٹانگ مار سکتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنی جگہ بیٹھ بھی نہیں سکتی کیونکہ جب وہ بیٹھنے لگتی ہے تو گلے میں پڑی بلی اس کے بدن سے پہلے زمین تک پہنچ جاتی ہے اور اس کی گردن میں پھنسنے لگتی یہ گائے صرف کھڑی رہ سکتی ہے اِس وقت یہ بہت اذیت محسوس کرتی ہے یہاں تک کہ کچھ دنوں کے بعد جب اِس کے گلے سے بلی اُتار بھی لی جائے تو بھی یہ اپنے مالک کے تابع ہی رہتی ہے۔

بلال نے یہ سب دیکھا تھا جبھی وہ گھر آ کر رو رہا تھا۔میرا نے بلال کو بہلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ بہت دکھی ہو رہا تھا کہ ارباز آ گیا پھر جب ارباز کو یہ سب معلوم ہوا تو اِس نے بھی بلال کو سمجھانے کی کوشش کی مگر بلال روئے جا رہا تھا اور روتے روتے کہنے لگا۔

'' انسان ایسے کیسے کر سکتا ہے یہ ظلم ہے پاپا مجھے جلدی سے بڑا کر دیں میں انھیں سزا دوں گا جو کسی سے بھی اِس سے اِس کی مرضی کی زندگی چھین لے مجھے نفرت ہے ایسے لوگوں سے''

اچانک ارباز نے بلال کا ہاتھ پکڑا اور اُسے لے جا کر اُسی گائے کے سامنے کھڑا کر دیا ۔بلال اُس گائے کو دیکھ کر اور بھی زور زور سے رونے لگا۔ارباز نے گائے کی گردن سے بلی کھول کر پھینک دی۔

اب بلال کا رونا بند ہو چکا تھا۔وہ گائے کی گردن سہلانے لگا اور اسے پیار کرتے ہوئے مسکرانے لگا اور ایک احساسِ تفخر سے ارباز کو دیکھتے ہوئے بولا ۔ you are the

best man of the world

مگر ارباز اپنے بیٹے سے نظریں چرانے لگا اسے یوں لگا جیسے بلال گائے کی نہیں بلکہ میرا کی گردن سہلا رہا اور پیار کر رہا ہے۔۔

☆☆☆
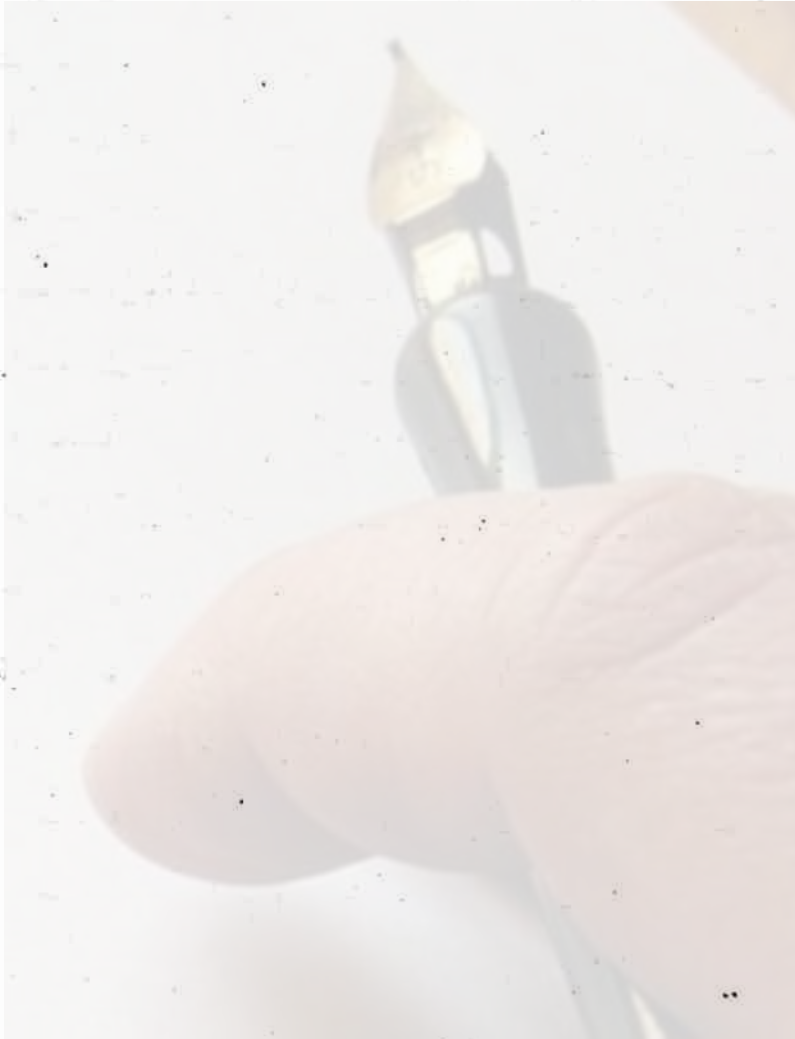
سپر سسٹم

دروازے کی مسلسل بجنے والی گھنٹی سے عرفان صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ نجانے اس وقت کون آ گیا۔ انہوں نے سرہانے پڑی گھڑی اُٹھائی اور لیمپ کی روشنی میں وقت دیکھا جب گھڑی نے رات دو بجے کا وقت دیکھایا تو وہ اور بھی حیران ہو گئے اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتے گھنٹی دوبارہ بج اُٹھی۔

دروازے پر پہنچ کر انہوں نے با آوازِ بلند پوچھا ''کون ہے بھائی اس وقت؟''

''ابا جی میں ہوں ندیم!''

اگلے ہی لمحے عرفان صاحب نے دروازہ کھول دیا اور بے اختیار اپنے بیٹے ندیم کو اپنے گلے لگا لیا۔ انھیں ایسا محسوس ہوا گویا برسوں کی تھکن اُتر رہی ہے خون کی گردش بڑھنے لگی تو انھوں نے بے اختیار ندیم کو پیار کرنا شروع کر دیا۔

ندیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے پہلے وہ اپنے باپ سے ملا تھا اور اب اماں اُسے پیار کر رئیں ہیں۔ اُس کے دل میں سکون کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ سارے وسوسے اور خدشات اپنی موت آپ مر گئے جن کی نشاندہی اُس کے اُن ساتھیوں نے کی تھی جنھوں نے وطن واپس آنے کے بجائے پرائے دیس مین ہی رہنے کو ترجیح دے تھی۔

عرفان صاحب ندیم کو اِسی طرح گلے لگائے، لگائے ٹی وی لاونج میں لے آئے اور صوفے پر بیٹھا دیا۔ وہ ابھی تک حیران تھے کبھی اللہ کا شکر ادا کرتے اور کبھی ندیم کو محبت پاش نظروں سے دیکھے جاتے۔

پھر ندیم نے خود ہی اُن کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ صوفے پر بیٹھا لیا اور باتیں کرنے لگا۔

ندیم عرفان صاحب کی اکلوتی اولاد تھا، لائق ہونہار اور فرمابردار شروع ہی سے اپنی جماعت میں نمایاں پوزیشن پر رہا اور پھر جب ماسٹرز کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے اسکالرشپ پر باہر گیا تو عرفان صاحب نے اُسی دن سے اُس کی واپسی کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔
اُنہیں اپنے بیٹے پر بہت فخر تھا۔ لیکن جب تعلیم کے مکمل ہونے پر اُسے وہیں نوکری کی پیشکش ہوگئی تو اُنھیں دل میں پھانس سی چبھنے کا احساس ہوا اور ایسا لگا جیسے سانس آنے جانے سے انکار کر رہی ہے۔ جسم کی ساری توانائیاں منہ موڑنے لگی ہیں اور خون آنتوں میں ٹھہر گیا ہے۔ اپنی ہی زندگی بے معنی اور بے وقعت محسوس ہونے لگی۔ جبھی تو انھوں نے فون پر ندیم سے کہہ دیا تھا کہ مجھے اب لگتا ہے کہ میرا وجود بے معنی ہو گیا ہے۔ میرے اپنے خوابوں کا دکھ مجھے کوئی نیا خواب دیکھنے ہی نہیں دیتا میں تو آج بھی اُسی خواب میں زندہ ہوں جو روبینہ تیری ماں میری آنکھوں میں بسا گئی اور تیرا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر بولی!
''میری خوشبو ہے اِس میں، تم اکیلے نہیں میں ندیم کی صورت تمہارے ساتھ ہوں بس تمہیں مجھے محسوس کرنا ہوگا دل کی نظر سے مجھے ڈھونڈ لینا ندیم میں، تو زندگی آسان ہو جائے گی''
پھر میں نے تم میں روبینہ کو ڈھونڈ لیا اور اپنے بیٹے کو بھی مگر اب جب تم کہہ رہے ہو کہ تمہیں یہاں ہی رہنا ہے تو تم نے مجھ سے میرا بیٹا ہی نہیں میری روبینہ کی خوشبو بھی چھین لی ہے۔
ابا جی نے تو یہ سب کہہ کر فون رکھ دیا مگر ندیم کے اندر اُس بچے کو جگا دیا جس نے ماں کے مرنے کے بعد باپ ہی کے سینے لگ کر ماں اور باپ دونوں کی گرمی محسوس کی تھی۔ تو اب وہ کیسے اپنے باپ کو اس عمر میں تنہا کر دیتا اب ہی تو محبتوں کا سود لوٹانے کا وقت ہے۔ سو جب اُس نے استعفاء دینا چاہا تو کمپنی کے سربراہان نے اُس کا استعفاء منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اتنے ہونہار انسان کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ اُن کی پارکھی نظریں یہ دیکھ رہی تھیں کہ ندیم جیسے ذہین فرد کی اُن کے سپر سسٹم میں کتنی ضرورت ہے۔

ندیم نے اپنے ابا جی کے بارے میں بتایا تو وہ اِس پر بھی رضامند ہو گئے کہ اگر اُس کے والد اُن کے ساتھ وہاں رہنا چاہتے ہیں تو ضروری کاغذی کاروائی کے بعد وہ بھی اُن کے ساتھ ہی رہیں۔ مگر ندیم جانتا تھا کہ ابا جی اپنے دیس اپنے شہر اور سب سے بڑھ کر اماں کی آخری آرام گاہ

سے کس قدر جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں۔ بقول اُن کے اُن کی روبینہ آج بھی اُن کی ہر بات سنتی ہے ۔وہ بتاتے کہ روبینہ آج بھی منتظر ہے کہ میں کب اپنے پوتے کی اُنگلی پکڑے اس سے ملوانے آؤں گا۔

ندیم اپنے باپ کی ماں سے والہانہ وابستگی سے باخوبی واقف تھا جبھی تو چپ چاپ واپس آ گیا۔اُسے اپنے والد بہت عزیز تھے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ابا جی کبھی بھی دیارِ غیر جانا پسند نہیں کریں گے اور وہ انہیں اِس عمر میں اپنے سے دور نہیں رکھ سکتا تھا اور نہ ہی خود رہ سکتا تھا۔ابا جی اُس کے لئے سب کچھ تھے۔اُس کے ہاتھوں میں ابا جی کی انگلیوں کا لمس اب بھی موجود تھا۔اِسی لمس کو دیارِ غیر میں اُس نے محسوس کر کے اپنے مستقبل کے سارے خواب دیکھے تھے۔اب جب تعبیر جینے کا وقت آیا تو وہ کیسے اپنے ابا جی کے بناء جی سکتا تھا۔پھر جب ابا جی نے فون پر یہ سب کہا تو وہ واپس آ گیا۔اب اُسے یہاں ہی رہنا تھا اپنی پوری دنیا کے ساتھ جو اُس کے ابا جی سے ہی شروع ہوتی اور اُنہی پر ختم ہو جاتی۔

ایک ہفتے کے بعد ہی اُس نے مقامی یونیورسٹی میں اپنے کاغذات جمع کروا دیئے۔ندیم کی تعلیمی سند پر دنیا کے سب سے بڑے ملک کی طرف سے اعلیٰ کامیابیوں کہ مہریں ثبت تھیں چنانچہ اُسے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کی سیٹ پر تقرری کا عندیہ مل گیا۔اُس نے جب یہ خبر عرفان صاحب کو سنائی تو اُنہیں اپنے بیٹے پر بہت فخر محسوس ہوا اور ایسا لگا جیسے جھکی کمر میں پھر سے تناؤ آ گیا ہے اور سکڑتا سینہ کشادہ محسوس ہونے لگا۔

ندیم نے اپنے فرائض منصبی سنبھال لیے اور اپنے وطن کے معماروں کی تربیت میں سرگرم ہو گیا۔وہ خود بھی تعلیم کے ساتھ ساتھ چونکہ ذہن سازی کے عمل سے بھی گزرا تھا جس کی وجہ سے روشن خیالی اُس کی سوچ میں در آئی تھی۔اب وہ اپنا سارے کا سارا علم اپنے طالبِ علموں کو منتقل کر رہا تھا۔

عرفان صاحب ندیم کی کامیابیوں سے بہت مطمئن تھے جبھی تو اب وہ ندیم کی شادی کا سوچ رہے تھے۔اس سلسلے میں وہ اپنے رشتے کے بھائی کی بیٹی کا انتخاب بھی کر چکے تھے۔ندیم کی فرمابرداری انہیں پورے اختیارات سونپ چکی تھی۔

عرفان صاحب اب جب روبینہ سے باتیں کرنے گئے تو اُسے خوشخبری بھی سنائی جہاں ہوائیں اتنی موافقت میں تھیں، وہیں ایک جھونکا مخالفت کا بھی تھا اور وہ مخالف جھونکا میر نواز تھا

۔میر نواز کی ترقی کی راہ میں ندیم ایک بڑی روکاوٹ بن کر سامنے آیا تھا کیونکہ ندیم سے پہلے میر نواز اس منصب کے لیے اہل قرار پایا تھا۔اب یہ الگ بات ہے کہ اس میں اہلیت سے زیادہ سیاسی تعلقات کا عمل دخل تھا۔اس سے پہلے کہ فیصلہ طے پاتا ندیم کے کاغذات آ گئے اس کا تعلیمی معیار میر نواز کے قد کو چھوٹا کر گیا اور تعلقات پر بھی مصلحت کی گرد جم گئی اور یوں ندیم کو تقرری تو مل گئی،مگر میر نواز کی اَن دیکھی دشمنی میں لپٹی ہوئی۔میر نواز،ندیم کو ایک ایسے دشمن کی صورت میں دیکھ رہا تھا جس نے اُس سے ترقی کا زینہ چھین لیا تھا۔ندیم اِن سب سے بے خبر اپنے کام سے کام رکھے ہوئے تھا۔وہ اپنے طالبِ علموں پر ایک لگے بندھے نصاب کے بجائے سوچ کے مختلف زاویوں کے در وا کرتا اور اِس کی کوشش ہوتی کہ اِس کے طالبِ علم سلیبس کے ساتھ ساتھ سوچ کے بلند کے ٹو بھی سر کریں۔

میر نواز ندیم پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے تھا کہ کب کہیں کوئی ایسا لمحہ اُس کی گرفت میں آئے جس کا استعمال وہ اپنے انداز سے کر کے ندیم کے لیے مشکل کھڑی کرنے میں کامیاب ہو جائے اور اپنے لئے راستہ ہموار کرے۔

ندیم اپنے طالبِ علموں کے ساتھ بہت مشفق اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتا تھا وہ سمجھتا تھا کی سخت گیری طالبِ علموں اور اُستاد کے درمیان فاصلے اور تکلف کو جنم دیتی ہے جو طالبِ علموں اور اُستاد میں دوری بنا دیتی ہے۔

ایک دن جب جماعت کے لیکچر کے دوران ایک طالب علم نے سوال کیا

''سر ہمیں خدا کیسے ملے گا؟''

تو ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا

''خدا کی تلاش کا سرا تمہارے اپنے اندر ہے سب سے پہلے اپنے آپ کو تلاش کرو''۔

''جیسے کیا کرنا ہوگا اور کیسے کرنا ہوگا''؟ ایک دوسرے طالبعلم نے پوچھا

''خود کو پہلے اپنی نظر سے دیکھو پھر دوسروں کی نظر سے اور پھر خدا کی نظر سے'' ندیم نے

کہا

''خدا کی نظر سے! ایک انسان ہو کر!''

ایک طالب علم نے کچھ حیرانگی اور کچھ تلخی سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ ندیم کوئی جواب دیتا ایک دوسرا طالب علم بولا

''کیا یہ ممکن ہے؟''

''دراصل ہم خدا سے بچھڑ گئے ہیں ہمارا محور تو اللہ واحد ہو لاشریک ہے۔ جیسے ستارے اور سیارے اپنے اپنے مدار میں اپنے محور کے گرد گھومتے ہیں تو ٹھیک مگر جب اپنے مدار سے باہر نکل جاتے ہیں تو فنا اِسی طرح انسان بھی ہے۔ اِسے تسخیر کائنات کرنا تھا مگر اپنے مدار سے باہر نکل کر اپنے جیسے انسان ہی تسخیر کرنے لگا۔ ہمیں اپنے اذہان کو ایک نقطہ ایک دائرے اور ایک لائن تک مرکوز نہیں کرنا بلکہ قوس قزح کے رنگوں کی طرح بکھر کر کائنات کو تسخیر کرنا ہے مگر اِس کی اِبتداء اپنے آپ سے کرنی ہوگی۔ پھر یہ زمین ایسی بن جائے گی کہ آسمان بھی جھک کر دیکھنے پر مجبور ہو جائے گا۔''

ایک لمحہ رُک کر ندیم دوبارہ گویا ہوا!

''وہ دن آئے گا جب دنیا دیکھے ہم سے سیکھے گی کہ تقدیر کیسے بدلی جا سکتی ہے۔ ہمیں پہلا قدم اُٹھا کر شروعات کرنی ہے۔ مگر ہم ابھی تک یہی سوچ رہے ہیں کہ آیا شروع بھی کریں یا نہ کریں۔ بھٹکے ہوئے جو ہیں۔ ہم نے ابھی تک اپنے ذہنوں کو جگایا ہی نہیں بلکہ تھپک تھپک کر سلا رہے ہیں کبھی تقدیر کی تھپکی دے کر اور کبھی قسمت کی''۔

''کیا انسان اتنا طاقت ور ہے کہ تقدیر کو بدل سکتا ہے؟'' ایک سوال آیا

ندیم نے بناء تامل کہا

''کیوں نہیں انسان کو خدا نے بہت طاقت ور بنایا ہے وہ چاہے تو تقدیر کو بھی بدل سکتا ہے لیکن ناممکن امر کے لئے کار بھی کھٹن کرنے پڑتے ہیں یہ ایک دن کا کام نہیں ہر نسل کو اپنے حصے کا کام کرتے ہوئے اِسے آگے بڑھانا ہوگا۔ کام کا رُوک دینا بھی ایک طرح کی نیند میں چلے جانا ہے۔''

''سر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ابھی تک کسی نے شروعات ہی نہیں کی تو پھر ہم یہاں تک کیسے پہنچے؟ کیا ہم نے کوئی ترقی نہیں کی؟''

''ہم کہیں نہیں پہنچے بلکہ ہم نے تو ابھی اپنا سفر ہی شروع نہیں کیا یہ سب ترقی ہم نے نہیں کی مغرب نے کی ہے۔ جیسے مغرب نے تحقیق کے سمندر سے ایک سپر سسٹم کشید کیا ہے۔''

''سر یہ سپر سسٹم کیا ہے؟''

''سپر سسٹم ایک ایسا رائج فعال انفرا اسٹرکچر ہے۔ جو کہ نہ صرف اپنے ملک کے

باشندوں کی فلاح کے لیے سود مند ہے بلکہ دنیا بھر سے اُس ملک میں آنے والے کیسے فال طرز سے اِس میں ضم ہو سکتے ہیں۔ کیا ہمارا انفرا اسٹکچر اتنا مضبوط ہے کہ اپنے ملک کے ہر شہری کو اِس کی ذہنی قابلیت کے مطابق کام کرنے کے مواقع فراہم کر سکے؟''

اِس سے پہلے کہ گفتگو اور آگے بڑھتی پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج اُٹھی اور گفتگو رُک گئی۔ جو گفتگو بغیر کسی نقطہ انجام پر ختم ہو وہ بے جا بحث کے کئی پہلو اُجاگر کرتی ہے۔ اسی لیے جب کلاس سے باہر کارڈور اور کینٹین میں بھی طالبعلم اِس گفتگو کو زور وشور سے کرنے لگے تو یہ باقاعدہ بحث کی صورت اختیار کر گئی۔

میر نواز کو شاید اِسی لمحے کا انتظار تھا۔ اب وہ باقاعدہ چوکنا ہو گیا اور اُس نے کچھ ایسے پالتو اور اپنے جیسے خوشامدی طالب علموں کو ان بحثوں میں چھوڑ دیا جو اِس گفتگو کو موڑ کر کبھی عقیدے اور کبھی مہذب کی بند گلی میں لے جاتے اور پھر نوجوانوں کے ناپختہ ذہن اور گرم خون اپنے سوالوں کے جوابوں میں ایک دوسرے سے الجھنے لگے۔ چنگاری بھڑکتے بھڑکتے شعلوں کی لپٹوں کی صورت اختیار کرنے لگی تو میر نواز، اِس پر تیل ڈالنے کا کام کرنے لگا۔

آخر کار ایک سیدھی سادھی گفتگو کو سیاست کے رنگ میں رنگ کر اس سے سیاہ ست نکال لیا اور ندیم کے لیکچر اور گفتگو کو اسی سیاہ ست سے رنگ کر اتنا اُچھالا کہ ندیم کو حکامہ بالا کے سامنے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑا۔

وہ سیاسی طاقتیں میر نواز کو مبارک باد دے رہیں تھیں کہ میر نواز، نہایت چالاکی سے اِس کھیل کو اِس نہج پہ لے آیا ہے کہ یا تو ندیم خود ہی دل برداشتہ ہو کر نوکری چھوڑ دے گا یا پھر اُسے مجبور کر کے معافی نامہ لکھوایا جائے گا۔ ندیم چونکہ جانتا ہے کہ وہ غلط نہیں تو یقیناً وہ معافی نامہ نہیں لکھے گا یوں ایک طرح سے اِس کا عمل بغاوت کے زمرے میں آئے گا اور اگر کسی مصلحت کے پیش نظر وہ لکھ دے گا تو دوسرے لفظوں میں یہ اُس کا اقبال جرم ہوگا اور ثبوت کے لیے کچھ ایسے طالبعلموں کا استعمال کیا جائے گا جن کو مہرے کے طور پر تیار کیا جا رہا ہے۔

وہ دن شاید پوری طرح ندیم کی مخالفت میں تھا کہ جب اُسے اِن سب کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ گم سم ہو کر رہ گیا۔ اُس کے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اُس کے نظریات کو یہ لوگ بغاوت، غداری اور گمراہی کی عینک سے دیکھیں گے اُس پر میر نواز کا باتوں کو توڑ موڑ کر ایسی

تصویر دیکھانا جو ندیم کو ملک دشمن اور اسلام دشمن کے فریم میں سمو رہا تھا۔ آخر کار میر نواز کی عیاری اور چالاکی جیت گئی جبکہ ندیم کی معصومیت اور سچائی دب گئی میر نواز نے اس مسئلے کو کچھ ایسے اُلجھایا کہ ندیم پر اس طرح کے چارجز لگے کہ اُسے جیل جانا پڑا۔

عرفان صاحب کے لئے یہ بہت کڑا وقت تھا۔ وہ ندیم کی ضمانت کے لئے وکیلوں کے آفس کے چکر لگا رہے تھے تو دوسری طرف میر نواز جیل میں قید ندیم کے لیے وہ راشی اور مفاد پرست آفسران خرید رہا تھا، جو بلا جواز ندیم کو جسمانی اذیت دے رہے تھے تا کہ ندیم جیل میں اُس اقرار نامہ پر دستخط کر دے جس کی تحریر کی روح سے ندیم یہ سب کچھ کسی خاص مقصد کے تحت کر رہا تھا۔ ندیم پر یہ بہت کڑا وقت تھا اُسے ناکردہ گناہ کی سزا دی جا رہی تھی اُس پر بہت سخت قسم کے چارج لگا کر نا قابلِ برداشت سزائیں دی جا رہیں تھیں۔ قانون کے محافظ میر نواز کے آگے بک چکے تھے۔ میر نواز جتنا اِن کی جیبیں گرم کرتا ندیم کو اذیت دینے میں وہ اُتنی ہی تیزی لے آتے۔

پہلی پیشی پر جب ندیم کو جج کے سامنے پیش کیا گیا تو عرفان صاحب کو لگا یہ اُن کا وہ بیٹا ہی نہیں جس کے پاس دنیا کے سب سے بڑے ملک کی اعلیٰ یونیورسٹی کی ڈگری تھی۔ اُس دن انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے ندیم کو واپس بلا کر سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ شام جب وہ دکھی دل کے ساتھ روبینہ کو حال دل سنانے گئے تو وہیں بے ہوش ہو گئے۔

جب آس پاس کے لوگ انہیں ہوش میں لائے تو انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے روبینہ اُن سے کہہ رہی ہے کہ ندیم کے لئے اپنے آپ کو سنبھالیں۔ وہ اپنی تمام ہمتیں جمع کر کے اُٹھے اور وکیل کے آفس کی طرف چل دیے وہ ندیم کی رہائی کے لئے ہر قیمت دینے کو رتیار تھے۔ مجبوریوں کے خریداروں کے اس معاشرے میں انہیں بھی بھاری فیس کے عوض ایک بڑے وکیل صاحب مل گئے۔

بیرسٹر حارث ندیم کی ضمانت کروانے میں کامیاب تو ہو گئے مگر اُس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ ندیم بچپن سے پیار و محبت کی چھاؤں میں پلا بڑھا تھا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ایسے ملک چلا گیا جہاں انسان اور انسانیت سے پیار کیا جاتا ہے۔ اِسی لئے انسانی زندگی کی آسائش اور آرام کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ وہ اِس ظلم کی تپتی دھوپ اور سفاک رویے سے ملنے والی اذیت اور تشدد کو برداشت نہ کر سکا اُس کی یہ تکلیف جسمانی بھی تھی اور ذہنی بھی جس نے اُسے نیم پاگل سا کر دیا۔

عرفان صاحب اُسے گھر لانے کے بجائے ہسپتال داخل کروا آئے اُمید تھی کہ وہ جلد یا بادیر ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا وہ جب بھی بہتر ہونے لگتا تو کورٹ میں پیشی کی تاریخ آ جاتی جہاں جانا ضروری ہوتا تو اُسے جہنم کدے میں گزرے وقت کی اذیتیں پھر سے یاد آ جاتی جو اُس کے زخم ہرے کر دیتا اور وہ الاسٹک کی طرح کھنچ کر اُسی غیر یقینی کیفیت میں چلا جاتا ۔ ایسے میں میر نواز کا اُس کی عیادت کو آنا اور مسکرا کر اُس کا حال پوچھنا ندیم کی ذہنی اذیت پر وہ چوٹ ہوتی جو اُسے دوبارہ اُسی پاگل وادی میں دھکیل دیتی۔

انہی حالات میں بالآخر اس کے کیس کا فیصلہ آیا کہ ندیم کی ذہنی حالت کے پیشِ نظر اس کیس کو یہاں بند کیا جاتا ہے اور ندیم کو کسی بھی ادارے کے لئے نااہل قرار دیا جاتا ہے ۔

عرفان صاحب جب جب ندیم کی یہ حالت دیکھتے تو اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہراتے اپنی زندگی بھر کی محنت اور اپنے مستقبل کا یہ انجام اُنہیں ہر وقت نا اُمیدی کے خدشات میں غرق رکھتا۔ شکستہ عمارت زیادہ جھٹکے برداشت نہیں کر سکتی یہی عرفان صاحب کے ساتھ ہوا۔ وہ ایک رات ایسے سوئے کہ صبح نہ اُٹھ سکے۔ ندیم کی ذہنی حالت اب بھی ویسی ہی تھی۔

ایک دن وہ گھر سے نکل گیا سارا دن چلتا رہا کبھی کہیں رُک جاتا اور پھر دوبارہ چل دیتا جب بہت تھک گیا تو ایک باغ کے بینچ پر جا بیٹھا۔ وہ ہوش و خرد سے بے گانہ بیٹھا تھا کہ قریب کے دوسرے بینچ پر ایک مزدور گہری نیند سو رہا تھا۔ ندیم اُسے غور سے دیکھنے لگا اور سوچنے لگا یہ کیوں سو رہا ہے۔ اگر یہ سوتا رہے گا تو ہمارا ملک کیسے ترقی کرے گا ترقی نہیں کرے گا تو ہم کیسے ایک سپر سسٹم بنا سکیں گے اسے جاگنا ہوگا۔ میں اِسے جگاؤں گا اپنے ملک کی ترقی کے لئے ایک سپر سسٹم کے لئے یہی سوچ کر ندیم اُس بینچ کی طرف بڑھا دیکھا تو قریب ہی ایک بھاری پتھر پڑا تھا۔ ندیم نے ہمت و کوشش سے وہ بھاری پتھر اُٹھایا اور اُس خواب دیکھتے مزدور کو جگانے کی خاطر اُس کے سر پر دے مارا۔ مزدور کی آنکھیں تکلیف کی اذیت سے کھل گئی مگر دھڑکنیں خاموش ہوگئیں ندیم مردہ شخص کی کھلی آنکھیں دیکھ کر خوش ہو گیا مگر جب اُس نے گردن گھما کر دیکھا تو کچھ فاصلے پر ایک دوسرا شخص گہری نیند سو رہا تھا ندیم اب اُسے جگانے اُس بینچ کی طرف بڑھ رہا تھا اور اُس کی نظریں بھاری پتھر پر مرکوز تھیں۔۔۔

☆☆☆

لفظوں کی ردا

شاید میں ہی بہت جذباتی تھی کہ یک طرفہ محبت کے صحرا میں سراب کے پیچھے بھاگتی بھاگتی یہاں تک آ گئی تھی۔ ہاں ہاں وہ سراب ہی تو تھا جبھی تو پورے چار سال گزارنے کے بعد اُسے اِحساس ہوا کہ میرا اُس کا رشتہ مناسب نہیں۔

یہ اِحساس اُسے اُس وقت کیوں نہ ہوا جب ہم گھنٹوں کیفے ٹریا میں بیٹھے رہتے میں اُسے اکثر اپنی غزلیں اور نظمیں سناتی جن پر وہ بے اختیار بے پناہ داد دیتا، مجھے سراہتا میں ہواوں میں اُڑنے لگتی پھر مجھے کسی اور کی داد کی کسی اور کی ستائش کی تمنا ہی نہ رہتی زین کی پزیرائی مجھے مکمل کرنے لگتی اور میں اِس میں ڈوب کر اور بھی زیادہ لکھتی یہی وجہ تھی کہ ماسٹر کے بعد ہی میرا پہلا مجموعہ کلام 'میں تم اور محبت' بھی آ گیا۔ اُس دن تم بھی تو کتنے خوش تھے۔

مگر جب تمہارے گھر والوں کو یہ پتہ چلا کہ میں شاعرہ ہوں تو اُنھوں نے اِسے ہی اعتراض بنا کر شادی سے اِنکار کر دیا اور تم نے خاموشی سے اپنے گھر والوں کے سامنے سر جھکا دیا ۔اُس دن میری شاعری ہمارے بیچ آ گئی۔ وہی شاعری جو ہماری تھی، ہماری محبت کے اسیر لمحوں کی روداد، ہمارے جذبوں کی گواہ، ہمارے وعدوں کی امین، مگر تم نے ایک ہی لمحہ میں سب جھٹلا دیا۔

میں تم سے ملنا چاہتی تھی بات کرنا چاہتی تھی کوئی حل تلاش کرنا چاہتی تھی مگر سب ہوائیں ہمارے مخالف تھیں کہ محبت کی طنابیں ہاتھوں سے چھوٹنے لگیں ۔تم دوسرے کنارے پر جا کر کھڑے ہو گئے اور میں اس کنارے بیچ میں سمندر جیسے لوگ اور لہروں جیسی روایات آ گئیں تو فاصلے اتنے بڑھے کہ پاٹنا ناممکن ہو گیا۔

پھر تمہارے فراق لمحوں کا زہر میری شاعری پینے لگی اور سقراط کی مثال بن گئی۔میرا محبت سے اعتبار ہی اُٹھ گیا اِس خالی جگہ کو تنہائی پُر کرنے لگی۔مگر اِس تنہائی میں بھی شاعری نے مجھے تنہا نہیں رہنے دیا وہ آ کر میرے ساتھ رہنے لگی تو میرا دوسرا مجموعہ کلام 'نیلا رنگ' آیا۔شاید تنہائی کا رنگ نیلا ہی ہوتا ہے۔

اب میرا اندر خالی ہو چکا تھا۔محبت سے بھی اور نفرت سے بھی۔مگر میں اِس بنجر دل میں زندگی کی رمق ڈھونڈنے لگی۔تیس سال میں اتنی سمجھدار ہو گئی تھی کہ آنے والے وقت کی سفاکی کا اندازہ کرسکوں کہ اب ماں باپ کا گھر بہن بھائیوں کے بہت سے گھروں میں بٹ چکا تھا میرے بوڑھے والدین کسی فالج زدہ جسم کے حصے کی طرح مجھ سے نبھا رہے تھے۔

ایسے میں جمال کا ہاتھ میری جانب بڑھا۔میری دوسری کتاب جمال ہی نے پبلش کی تھی۔جمال نے میری شاعری کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا اور مجھے اِس سے بھی زیادہ پڑھا۔میں بھی تنہائی سے اوب چکی تھی۔بنا اُسے جانے اُس کے سامنے ورق ورق کھلنے لگی۔جمال نے مجھے مختلف مشاعروں اور نشستوں میں متعارف کیا کروایا کہ میرے کلام کے دلدادہ مجھے سراہانے لگے۔مشاعروں میں میری موجودگی گویا اِس مشاعرے کی کامیابی کی دلیل بن جاتی۔آہستہ آہستہ عزت، دولت دونوں سے میری جان پہچان ہونے لگی۔

پھر بیرونِ ملک کے مشاعروں نے گویا مجھے پرواز کے نئے پنکھ دے دئے ایسے میں، میں جمال کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھتی، جمال بھی میرے گرد ایک حصار کی مانند رہتا اور میں اِس کے حصار میں مقید رہنے کے باوجود ہواوں میں اُڑتی رہتی۔

اُس رات بھی جب بیرون ملک ایک کامیاب مشاعرے سے لوٹی تو دیکھا ثوبیہ میری چھوٹی بہن گھر آئی ہوئی ہے پاپا نے بہت یاسیت سے کہا کہ میں معلوم تو کرو کہ وہ آخر وہ کیا وجہ ہے جو یوں وہ اکیلی بچوں کے بناء ہی ملنے آگئی اور اب یہاں ہی رہ رہی ہے۔

اپیا ثمر کے کسی دوسری عورت سے تعلقات ہیں۔اپیا یہ دوسری عورت ایسا کیسے کر لیتی ہے کہ کسی کا بھی ہنستا بستا گھر اُجاڑ کر اپنے نام کی تختی لگا لیتی ہے۔کیا دوسری عورت کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ثوبیہ مسلسل رو رہی تھی۔

صبح آنکھ کھلی تو دیکھا ثوبیہ جائے نماز پر بیٹھی اُس دوسری عورت کو بددعائیں دے رہی

تھی جو اُس کے معصوم شوہر سے تعلقات رکھتی تھی۔ پاپا کو جونہی معاملات کی نزاکت کا احساس ہوا انھوں نے ثمر کے گھر والوں سے بات کی اور کچھ تگ ودو کے بعد ثوبیہ ثمر کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی تو مجھے بھی سکھ کا سانس آیا۔

میرا تیسرا مجموعہ اشاعت کے مراحل میں تھا۔ جمال ہی کے پبلشنگ ادارے سے چھپ رہا تھا پھر ثوبیہ کے معاملات میں ایسی اُلجھی کہ جمال سے بات ہی نہ ہو سکی تھی۔ میں اچانک اُس کے آفس پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہ ہسپتال گیا ہے جہاں اُس کی بیوی اپنی ڈلیوری کے لیے داخل ہے۔کوئی چیز میرے اندر ٹوٹنے لگی ۔

واپسی کا سفر بہت طویل لگ رہا تھا تمام راستے میرے کانوں میں ثوبیہ کے الفاظ گونجنے لگے اور اُس کی دوسری عورت کے لئے مانگی بددعائیں میرا پیچھا کرنے لگی، کبھی جمال اور کبھی زین دونوں کے چہرے گڈمڈ ہو کر میرے اعصاب کو جھنجوڑنے لگے۔ ایک بار جی میں آیا کہ ابھی فون کر کے جمال کی خبر لوں مگر کیا کہوں گی، کچھ بھی کہہ لوں مگر رہوں گی تو دوسری عورت ہی نا۔

مرد کتنی آسانی سے کسی عورت کو دوسری عورت بنا دیتا ہے اور پھر الزام بھی اِسی کے سر رکھ دیتا ہے کہ عورت ہی عورت کی دشمن ہے حالانکہ رستہ تو یہ خود دیکھاتا ہے اور اِس پر چلنے کے لئے اپنا سہارا بھی پیش کر دیتا ہے۔ یہ سب سوچ کر ہمت ہی نہ رہی۔ محبت نفرت، وفا بے وفائی، ہجر وصال، ملن جدائی سارے الفاظ میرے سامنے ناچنے لگے اور میرے کانوں میں میرے ہی اشعار گونجنے لگے۔

جمال کا فون آیا وہ بالکل نارمل بات کر رہا تھا ہمیشہ کی طرح وہی ہنسی مذاق وہی چھیڑ چھاڑ وہی گدگداتی سرگوشیاں میرا دل و دماغ سن تھا جو آہستہ آہستہ جمال کی باتوں سے نارمل ہونے لگا پھر میں بھی ویسی ہی ہوگئی۔ جمال جیسی میں نے بھی کوئی گلہ نہ کیا کوئی شکوہ لبوں تک نہ آیا ۔کوئی صفائی نہ مانگی بلکہ اُسی کی طرح باتیں کرنے لگی پینتیس سال میں کم از کم ٹھہراو کے ساتھ دل تھام کر چلنا آ ہی گیا تھا۔

تیسرا مجموعہ کلام منظر پر آ گیا تقریب رونمائی بھی ہوگئی اور پزیرائی کی محافل بھی سجیں میں اسٹیج پر بیٹھی لوگوں کی تالیوں کی آوازیں سنتی اور مسکراتی رہتی ۔قبولیت۔ مقبولیت اور محبوبیت کے جذبے لپک لپک کر میری جانب بڑھتے اور میں مسکرا مسکرا کر سمیٹتی رہتی۔

میں سب جذبوں کو برت چکی تھی کسک، تڑپ، ہجر و صال، برسات، خزاں، حساب، کتاب، نفع نقصان، نشیب فراز پانا کھونا یہ شاعرہ سب کچھ جان چکی تھی پھر باقی کیا بچا تھا کہ فرہاد آ گیا۔ اُٹھتی عمر کا نوجوان شاعر میری شاعری کا مداح بن کر آیا اور پروانے کی طرح میرے آگے پیچھے منڈلانے لگا میں بھی اپنے زنگ لگے جذبوں کا زنگ کریدنے لگی۔ میری شاعری پھر سے جھملا اُٹھی، چوتھا مجموعہ آیا جو چاند کے بادلوں میں چھپنے نکلنے کے کھیل جیسا تھا میری شاعری کا پچھلا رنگ پکا تھا جو ابھی تک اونچ نیچ سنبھالے ہوئے تھا یہی وجہ تھی کہ میں اپنی مسند پر جم کر بیٹھی ہوئی تھی۔

فرہاد بائیس سال کے جذبوں کی آگ بسائے چھتیس سالہ اُس عورت کی طرف بڑھا تھا جو گیلی لکڑی کی طرح سلگ بھی چکی تھی اور دنیاداری کی بھٹی میں پک کر کندن بھی بن چکی تھی محبت کے دشت کی سیاہی میں آبلے اور خار چننے کے بعد وہ اب اس دشت کے سفر پر جانے کو تیار نہ تھی۔

فرہاد اور میرے ساتھ کو لے کر خالی ہاتھ رہ جانے والوں کی زبانیں لمبی ہونے لگیں تو میں نے فرہاد سے کنارہ کشی کر لی۔ میری جھولی میں بے حسی اور خودغرضی کا الزام گرنے لگا میں یہاں بھی چپ ہی رہی کہ کس سے کیا پوچھوں کہ اس سب میں میرا قصور کیا ہے۔

کچھ ماہ و سال بیتے اور میرا پانچواں مجموعہ کلام آیا تو میرے ساتھ نصیر کا نام لیا جانے لگا پھر چھٹا اور اب ساتواں تو میں نے سننا ہی چھوڑ دیا کہ اب کس کا نام لوگ لے رہے ہیں کہ کچھ تو لوگ کہیں گے لوگوں کا کام ہے کہنا!

میں آج بھی مشاعروں میں بلائی جاتی ہوں مائیک پر آ جاؤں تو لوگوں کی فرمائشوں کا سلسلہ چل نکلتا ہے اندرون ملک اور بیرون ممالک مشاعروں میں عزت و احترام سے مدعو کی جاتی ہوں۔ مشاعروں کے نذرانے، میری کتابوں کی رائیلٹی اور مداحوں کے تحائف میرے نام آتے ہیں اور اِن سب سے بڑھ کر آج بھی نئے مجموعہ کلام کی اشاعت پر زین کی طرف سے مبارک باد بھی گو کہ اب میرے لئے اِس کے معنی بدل چکے ہیں۔۔۔۔

☆☆☆

ٹھنڈا بوسہ

وہ ایک لمحہ تھا جو وقت کی گود سے گرا تھا اور اُس کی زندگی میں آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اُسے ایسے لگا جیسے بچپن میں برف پانی کا کھیل کھیلتے کھیلتے کوئی اُسے برف کر گیا اور پھر اُن کا کھیل تو ختم ہو گیا مگر اُس کے ہمجولی اُسے پانی کرنا بھول گئے اب وہ وقت کی آنچ سے قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔

کیسے لوگ دوسرے کی ضرورت سے بھی اپنا مفاد کشید کر لیتے ہیں آخر کیسے کر لیتے ہیں وہ ایسا؟ ۔سمیرا کی آواز میں کسی پرانے درد کے اُمڈ آنے کی سسکی سنائی دے رہی تھی۔

زریں کے لیے اپنی اِس حساس سی سہیلی کی بہت اہمیت تھی۔اس لیے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے بولی

''میری کیا مجال کے میں تمہاری بات سے انکار کرسکوں، تم یہ بتاؤ مجھے کب جانا ہوگا''؟

''پرسوں صبح نو بجے کا وقت ہے تم گاڑی لے کر آ جانا، خالدہ بھی تیار ہوگی، پھر ہم یہاں ہی سے ہسپتال چلیں گے''۔سمیرا نے اُسے تفصیل بتائی۔

''اب میں چلتی ہوں تم بے فکر رہو میں وقت پر پہنچ جاؤں گی''۔زریں نے سمیرا سے اجازت لی اور رخصت ہوگئی۔

خالدہ کو سمیرا کے گھر کام کرتے چار سال ہو گئے تھے دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھیں۔ جب خالدہ کی طبعیت خراب رہنے لگی تو وہ اپنے ساتھ اپنی تیرہ سالہ بیٹی چندا کو بھی لانے لگی جو کام کاج میں اِس کا ہاتھ بٹا دیتی جبکہ سمیرا کو اتنی چھوٹی بچی سے کام کروانا بالکل بھی پسند نہ تھا۔سمیرا، اکثر خالدہ کو منع کرتی اور سمجھاتی کہ یہ عمر اِس کی پڑھائی کی ہے تم کیوں اس سے کام کروا رہی ہو۔خالدہ اس کی بات سنتی اور کہتی

''باجی ہم غریب لوگ ہیں یہ پڑھائی ہمارے نصیب میں کہاں میری ماں بھی لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی میں بھی کرتی ہوں شاہد یہ بھی ایسا ہی کرے اچھا ہے ابھی سے کام سیکھ لے۔''

سمیرا چاہ کر بھی کچھ نہ کہتی اور دل ہی دل میں کڑھ کر رہ جاتی۔۔

پھر ایک دن چندا اکیلی ہی کام پر آ گئی۔سمیرا کے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُس کی اماں کی طبعت بہت خراب ہے اِس لیے وہ کام پر نہیں آ سکے گی مگر باجی آپ فکر نہ کریں میں سب کام کر دوں گی۔چندا نے معصومیت سے کہا۔

جب دو چار دن ایسے ہی گزر گئے تو سمیرا نے چندا سے کہا اپنی اماں سے کہو آ کر مجھ سے ملے۔سمیرا کا دل کسی طور چھوٹی سی بچی سے کام کروانے کے حق میں نہ تھا۔۔۔

دوسرے دن جب خالدہ آئی تو وہ واقع بہت بیمار لگ رہی تھی چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا تھا۔جسم بھی لاغر لگ رہا تھا سمیرا اُس کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگئی اور اِس سے اسکی صحت کی بابت پوچھنے لگی۔خالدہ نے اُسے بتایا کہ اُس کے پیٹ میں رسولی ہے جو بہت بڑھ گئی ہے ڈاکٹر نے آپریشن کا بولا ہے مگر ہم غریب کہاں اِس کی سکت رکھتے ہیں خیراتی ہسپتال والوں نے چار ماہ کا وقت دیا ہے انہیں اِس سے کیا کہ مریض چار ماہ تک جیتا بھی ہے یا نہیں، پھر مرض بھی بڑھ کر تن آور درخت بن جائے گا، یعنی میں نے مرنا ہی ہے دیکھیں موت پہلے آتی ہے یا ہسپتال کی باری۔اب اِسی آسرے پر انتظار کی سولی پر بیٹھی ہوں خالدہ کے لہجے میں مایوسی ہی مایوسی تھی۔

سمیرا کو ایسے لگا جیسے اُس کی ماں کی روح دور آسمان سے اُسے ہاتھ ہلا رہی ہے اُسے ماں بے تحاشہ یاد آنے لگیں وہ اپنے جذبات پر اپنا اختیار کھونے لگی۔اُس نے محبت پاش نظروں سے خالدہ کو دیکھا اور اپنے پاس بیٹھا کر تسلی دینے لگی تو خالدہ بھی انسانی محبت اور ہمدردی پا کر سسک پڑی۔

اُسی لمحے سمیرا نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اِس کا علاج کروائے گی اور اگلے ہی لمحے اُس نے خالدہ سے وعدہ بھی کر لیا کہ وہ اُس کا آپریشن خود کروائے گی اب وہ فکر نہ کرے بلکہ اللہ سے دعا کرے کہ وہ اُس میں کامیاب رہے پھر اُسے کچھ پیسے دے کر رخصت کیا۔

سمیرا کو اب خالدہ کے علاج کے لیے رقم کا بندوبست کرنا تھا چنانچہ اُس نے اپنی پس انداز رقم کا حساب لگایا اور کچھ اپنی سہیلوں سے کہا جیسے تیسے رقم کا بندوبست ہو جانے کے بعد اُس

نے اپنی سہیلی زریں کو اپنے ساتھ ملایا کہ وہ اِس کے ساتھ رہے کہ اگر کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو وہ بر وقت اُس کا تدارک کر سکے اپنے طور پر ساری تیاری کرنے کے بعد سمیرا نے ایک مقامی سیمی پرائیوٹ ہسپتال کی خدمات حاصل کر لیں اور خالدہ کو آپریشن کی غرض سے اِس میں داخل کروا دیا۔ہسپتال میں ساتھ رہنے کے لیے زریں نے پیشکش کر دی اور چندا کو وہ اپنے ساتھ گھر لے آئی ۔دوسرے دن خالدہ کا آپریشن ہو گیا جو کامیاب رہا اور کسی بھی قسم پیچیدگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا سمیرا خالدہ کے آپریشن کے دوران مسلسل اس کی بیٹی کے ساتھ اللہ کے حضور دعا گو رہی پھر جیسے ہی زریں کا فون آیا کہ آپریشن کامیاب رہا ہے اور اب کچھ دیر بعد خالدہ کو کمرے میں شفٹ کر دیا جائے گا۔تو اُس نے سکھ کا سانس لیا چندا کی بے قراری بھی اس سے چھپی ہوئی نہ تھی جو اپنی ماں سے ملنے کو بے چین تھی اِسی لئے وہ اُسے ساتھ لے کر ہسپتال چل دی۔

جب تک وہ ہسپتال پہنچیں خالدہ کو کمرے میں شفٹ کیا جا چکا تھا گو کہ وہ ابھی پوری طرح ہوش میں نہ تھی۔چندا خالدہ کو ایسے دیکھ کر رنجیدہ ہو گئی تو زریں اُس کو تسلی دیتے ہوئے دل بہلانے لگی۔سمیرا کمرے سے نکل کر باہر گاڈن کی طرف نکل آئی اُس کی بے چینی کچھ اور بڑھ گئی تھی اُس یاد آیا کہ کیسے

ماں کی حالت بھی دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔اُن کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہوتا جا رہا تھا وہ اپنی برداشت کے شاید آخری لمحات سے گزر رہی تھیں کہ اُس سے کہنے لگیں اب ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑے گا۔پھر جب ڈاکٹر نے اُن کے مکمل معائنے کے بعد کہا کہ اب آپریشن کے سوا کوئی چارہ نہیں۔آپ کے پیٹ میں رسولی بڑھتی جا رہی ہے اور یہ بہت نقصان دہ ہو رہی ہے آپ کو جلد از جلد اس کا آپریشن کروانا چاہیے۔

شاہد ماں جانتی تھیں کہ ڈاکٹر یہ ہی کہے گی اسی لیے ماں نے کسی حیرت کا مظاہرہ نہ کیا اور ڈاکٹر سے مزید معلومات لے کر خاموشی سے گھر آ گئیں۔

ماں بہت پریشان تھیں اور اُن سے بڑھ کر وہ پریشان تھی، اُس کے لیے ماں کیا تھیں یہ وہ ہی جانتی تھی عجیب عجیب خیالات کسی تسلسل کی طرح اسے ڈرا رہے تھے، کہ ایسے میں ماں کی ایک جاننے والی آئیں۔ماں کی پریشانی ان کے چہرے پر کسی سفید کپڑے پر داغ کی طرح عیاں تھی ۔جب انہوں نے اپنائیت سے ماں کی کیفیت پوچھی تو ماں سے رہا نہ گیا انہوں نے اپنی بیماری کی ساری حقیت ان پر آشکار کر دی۔

آنٹی نے سب کچھ سنا اور ماں کو تسلی دی کہ کچھ نہ کچھ کرتے ہیں سب ٹھیک ہو جائے گا پھر وہ جلد دوبارہ آنے کا کہہ کر چلیں گئیں۔ اگلے ہی دن وہ ماں کی پریشانی کے حل کے ساتھ اُن کے گھر پر موجود تھیں۔ لیکن نا معلوم انہوں نے ایسا کیا حل بتایا تھا کہ ماں ایک شش و پنج میں گرفتار ہو گئیں، پھر ماں نے سوچنے کا وقت مانگا اور جلد فیصلہ کرنے کا وعدہ کیا۔

ان کے جانے کے بعد ماں نے بتایا کہ وہ کہہ رہیں تھیں کہ اُن کے شوہر فراز ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں چنانچہ میڈیکل کی سہولیات بھی آفس کی طرف سے میسر ہیں جو کہ نا صرف اِن کے لیے بلکہ اِن کے بیوی بچوں کے لیے بھی ہیں۔ آنٹی یہ چاہتی ہیں کہ ماں اپنا آپریشن انہی میسر سہولیات سے حاصل کرالیں ماں کی عمر چونکہ آنٹی کی عمر کے ہی لگ بھگ ہے تو وہ فراز صاحب کی بیوی کی حیثیت سے اس سہولت سے فائدہ اُٹھا سکتیں ہیں اور بقول آنٹی کے وہ فراز صاحب سے بات کر چکیں ہیں انہیں کوئی اعتراض نہیں کہ فراز ایک بڑے دل کے مالک ہیں۔

ماں کو فراز صاحب کی بیوی کی حیثیت سے یہ سہولت مل جائے گی بہت خاموشی اور رازداری سے ماں کا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا مگر ماں کسی طور پر یہ ماننے کو تیار نہ تھیں اُس نے ماں کو بہت ڈھارس دی کہ یہ تو بہت چھوٹی سی بات ہے۔ آپ کون سا اُن کی سچ مچ میں بیوی بن رئیں ہیں یہ تو ایک طرح کی ایکٹنگ کرنی ہوگی اور آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ورنہ ہمارے پاس دوسری کیا صورت ہے کچھ بھی تو نہیں۔ پھر ماں نے بے بسی کی وہ چادر اُڑلی جو بے رحم وقت نے اُنہیں سونپی تھی۔

جبھی دوسرے دن ماں نے اُسی کے ذریعہ ہی آنٹی کو اپنی رضامندی دے دی۔ پھر اگلے دن وہ اُس مقامی ہسپتال پہنچ گئے جس کی سہولت انکل فراز کے کارڈ پر میسر تھی آنٹی نے انہیں کارڈ دے دیا تھا اور دوسرے ضروری کاغذات بھی ماں بہت گھبرا رہی تھیں ڈر تو وہ بھی رہی تھی مگر ماں کی صحت کے بارے میں سوچ کر ہمت بڑھا رہی تھی زندگی بھی کیسے کیسے پل عبور کرواتی ہے کہ بعد میں سوچ کر بھی حیرت ہوتی ہے کہ ہم اپنی جان سے پیاروں کی خاطر کیا کچھ کتنی آسانی سے کر گذرتے ہیں۔

پھر تمام کاغذی کاروائی کے بعد ماں کمرے میں شفٹ ہو گئیں کچھ ضروری چیک اپ کے بعد ماں کو دوسرے دن صبح آپریشن کا وقت دے دیا گیا۔ ماں آپریشن کو لے کر اتنی پریشان نہیں تھیں، جتنی اِس بات سے پریشان تھیں کہ کسی کو اس سب کا پتہ نہ چلے کہ اُنہوں نے آپریشن کیسے

کروایا ہے۔اُس تمام رات ماں اُسے یہ ہی بتاتی رہیں کہ اُسے ہر ہر وقت ماں کے ساتھ ہی رہنا ہے تا کہ نرس کو آواز نہ دینی پڑے کیونکہ نرس مریض کا نام لے کر آواز دیتی ہیں اور ماں کے نام کی جگہ تو مسز فراز لکھا تھا۔

ماں نے ہر ہر طرح کی احتیاط برتنے کو کہا اور آخر میں ماں نے اللہ سے دعا مانگی کہ اے میرے اللہ مجھے بے عزت ہونے سے بچا لینا میرے راز کی پاسداری کرنا مجھے معاف کرنا اس راز کو چاک ہونے پر میں موت کو ترجیح دیتی ہوں میری عزت کی حفاظت فرمانا۔مجھ غریب پر جن لوگوں نے یہ احسان کیا ہے ان کو آباد رکھنا اور ان کی اس نیکی کا بہترین بدل عطا کرنا ان کے سب گناہ معاف کر دینا۔

اُس نے دل کی گہرائیوں سے اس دن آمین کہا اور پھر تمام عمر اسکی پاسداری کی۔۔۔ اُسوقت اُس نے یہ بھی سوچا تھا کہ ابھی دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی۔

دوسرے دن ماں کو تمام تیاریوں کے بعد آپریشن تھیٹر لے گئے۔ایسے میں وہ کاریڈور میں بھائی اور بھابیوں کے ساتھ کھڑی ماں کے لیے دعا گو تھی۔آپریشن تھیٹر جاتے جاتے بھی ماں اُسے تنبیہی نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور وہ بھی نظروں سے ہی ان کا بھرم رکھنے کی یقین دہانی کرا رہی تھی۔

جب ماں آپریشن تھیٹر چلی گئیں تو گویا بھابیوں کو موقع مل گیا اور وہ باتوں باتوں میں پوچھنے لگیں کہ آپریشن کا خرچہ کیسے کیا انہیں شاہد یہ وہم تھا کہ ان کے شوہروں نے چھپ چھپ کر ماں کی مدد تو نہیں کی۔کاش ایسا ہی ہوتا وہ چھپ کر ہی سہی،اپنی ماں کی مدد کرتے تو یقیناً ماں آج اس بیماری میں اتنی پریشان نہ ہوتیں مگر وہ کوئی تلخ بات کر کے اپنے لیے مسائل نہیں پیدا کرنا چاہتی تھی اس لیے اپنے آپ کو تلاوت یٰسین میں مصروف کر لیا۔جس کا بر وقت فائدہ یہ ہوا کہ وہ بھابیوں کے بے جا سوالوں کے جواب دینے سے بچ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد آپریشن تھیٹر سے نرس باہر نکلی وہ بالکل تیار کھڑی تھی اِس سے پہلے کہ وہ ماں کا نام مسز فراز لے کر پکارتی وہ خود ہی نرس کی جانب لپکی۔

اُس نے بتایا کہ ماں کا آپریشن مکمل ہو گیا ہے سب کچھ خدا کے فضل و کرم سے ٹھیک رہا اب کچھ دیر ماں کو I.C.U میں رکھیں گے اور پھر کمرے میں شفٹ کر دیں گے آپ میں سے کوئی ایک جا کر ان کو دیکھ لیں ابھی وہ بے ہوش ہیں انہیں ہوش میں آنے میں کچھ وقت لگے گا۔

ماں I.C.U میں شفٹ ہو گئیں تو بھابیاں بولیں اب ہم چلتے ہیں امی تو ابھی بے ہوش ہیں ہو سکا تو ہم شام میں آئیں گے اور اگر نہ آ سکے تو برا نہ منانا۔ اُسے تو اِس وقت اُن کا جانا ایک نعمت لگا اُس نے مسکرا کر اِن کا شکریہ کہا اور وہ سب لوگ چلے گئے۔

اِن سب کے جانے کے بعد وہ ہسپتال میں ماں کے کمرے میں آئی اور آرام کرنے کی غرض سے صوفے پر بیٹھی تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی لمبی مسافت طے کر کے آئی ہو نجانے کب آنکھ لگ گئی نہ معلوم اُسے سوتے کتنی ہی دیر گزری تھی کہ یک دم تیز تمباکو کی مہک سے دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا اور ایسا لگا کسی نے اُس کے ہونٹوں پر برف رکھ دی ہے اچانک اُس کی آنکھ کھول گئی دیکھا تو فراز انکل اُس پر جھکے ہوئے تھے۔

وہ ایک دم گھبرا کر سنبھل کر بیٹھ گئی اسی اثناء میں نرس کے آنے کی آواز آئی وہ ماں کو کمرے میں شفٹ کرنے آئی انکل پر نظر پڑی تو مسکرا کر اُن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی آپ کی بیٹی صبح سے پریشان تھی۔ سمیرا کی نظر جونہی انکل سے چار ہوئی وہ فوراً کمرے سے نکل گئے۔

سمیرا سمیرا! زریں اُسے آواز دیتی اُس کے قریب آئی اور بولی خالدہ کو ہوش آ گیا ہے۔ چندا اِس سے باتیں کر رہی ہے۔ اَب وہ خوش ہے مگر یہ تمہیں کیا ہوا تمہارا چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے۔ سب اچھے سے ہو تو گیا ہے۔ بھئی خوش ہو جاؤ تم نے جونیت کی وہ پوری ہو گئی۔ ایک غریب عورت کو موت کے منہ میں جانے سے بچالیا۔

نہیں، نہیں میں نے تو ایک لڑکی کو اُس ٹھنڈے بوسے سے بچایا ہے۔ جس نے برسوں میرے منجمد ہونٹوں کو گنگ رکھا۔ سمیرا نے بے دھیانی میں کہا!

☆☆☆

پچھلے پہر کی خاموشی

گاؤں والوں کی سزا شروع ہو چکی تھی جبھی گاؤں کی زمین کو کلر چاٹ رہا تھا، نمک کی سفیدی آہستہ آہستہ کسی سرطان کی طرح پھیل رہی تھی اور گاؤں کے باسی اِسے چھوڑ کر اپنے گناہوں کی گٹھری اپنے سامان کے ساتھ اُٹھائے کسی دوسری جگہ اپنی نئی بستی بسانے جا رہے تھے۔

جس کی ملکیت جتنی کم تھی اُس کے لئے ہجرت اتنی ہی آسان تھی۔ ہر روز کوئی نہ کوئی خاندان اپنے ڈھور ڈنگر اور سامان کے ساتھ گاؤں چھوڑ جاتا بیل گاڑی کے پہیوں کے نشان جانے والے راستے پر پچھلے نشانوں پر نئے نشان ثبت کر دیتے جو ان میں گڈمڈ ہو جاتے۔

روز گاؤں کی مسجد میں خصوصی دعائیں مانگی جاتیں دعائیں تو قبول نہ ہوتیں مگر کنوؤں کا پانی کڑواہٹ کی حد تک نمکین ہو رہا تھا۔ درختوں کے پتے تیزی سے جھڑ کر انہیں بے ثمر اور بے سایہ کر رہے تھے اور جھاڑیوں کی جڑوں کو بیمار زمین خود ہی اُگل رہی تھی۔ گاؤں کے بزرگوں کے چہرے ویران اور آنکھیں اندر دھنستی جا رہی تھیں عورتوں کے سڈول اور پرکشش بدن اپنی کشش کھو رہے تھے اور مردوں کی سوچوں میں آنے والی زندگی کے وسوسے تھے۔ وہ گم صم رہنے لگے تھے۔ ہر سانس لیتی ہستی کے لیے زندگی مشکل ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ گاؤں پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے کہ رات کے وقت گھروں میں دئیوں کی روشنی بھی مدھم مدھم گدلی گدلی نظر آتی تھی۔

گاؤں کے بچوں کے کھیل بھی بدل گئے تھے۔ اب وہ سائیکل کا پہیہ بھی زمین پر نظر آنے والی سفید لکیروں پر چلاتے جو خود بخود بن گئیں تھیں اور دن بدن گہری بھی ہوتی جا رہیں تھیں بس انہی بچوں کا شور تھا جو زندگی کی خبر دیتا ورنہ ہر طرف ایک چیختا ہوا سناٹا تھا۔

ابھی کچھ وقت پہلے کی ہی تو بات تھی جب اس گاؤں کی مکئی کی مٹھاس مثالی تھی۔ مکئی کے

سوکھے دانے جب بٹیارن گرم ریت کی بھٹی میں بھونتی تو چارسو بڑے بڑے سفید پھول بن کر مہکنے لگتے تھے۔ اب زمین اتنی کڑوی کیسے ہوگئی؟ کہ زندگی کا ذائقہ ہی ختم ہونے لگا۔ پہلے کیسے گاؤں میں سب مل جل کر رہتے تھے۔ سب کے دکھ سکھ سب کی عزتیں سانجھی تھیں۔ جبھی تو درختوں کے پھل رسیلے اور زمین کی فصلیں بھر پور ہوتیں تھیں۔ سب کتنا پاکیزہ اور پُر نور تھا چاند کی چاندنی گئی پیار بھرے دلوں کی پاکیزہ محبت کی گواہ تھی۔ مگراب جیسے یہ سب خواب ہوگیا ہو۔

ماسٹر بدرالدین نیم کے درختوں کے نیچے ایک طرف لڑکوں اور دوسری طرف لڑکیوں کو پڑھاتا تھا۔ جب لڑکیاں دوپٹہ لینے کے قابل ہوجاتیں وہ ماسٹر بدرالدین کی بیوی صغراں سے سلائی کڑھائی اور دوسرے امور خانہ داری سیکھتیں۔ ایک میلا سا لگا رہتا ماسٹر بدرالدین کے گھر۔۔۔

گاؤں کی کسی بیٹی کی شادی ہو یا بیٹے کی، جہیز اور بری صغراں کے آنگن میں ہی تیار ہوتا ،خوشی غمی کے موقعے پر کتنے مہمان آئیں گے اوران کی تواضع کیسے ہوگی اس کا حساب کتاب بھی ماسٹر بدرالدین کے صحن میں پڑے موڑھوں پر ہی ہوتا۔ زمین کا لین دین ہو یا پانی کی باری کا حساب کتاب سب ماسٹر بدرالدین کے مشورے سے ہوتا غرضیکہ ماسٹر بدرالدین پورے گاؤں کی ضرورت تھا، اور تھا بھی ایسا مسکین کہ کبھی کسی کام کا معاوضہ اپنے منہ سے طے نہ کرتا جو بھی اپنی خوشی اور گنجائش سے دے دیتا ہنسی خوشی قبول کرتا اور اپنے رب کا شکر ادا کرتا۔ اُس کی گھر والی صغراں بھی اُسی کے رنگ میں رنگی ہوئی عورت تھی۔ اِن کے گھر کا دروازہ ہمیشہ ہر ایک کے لیے کھلا رہتا اگر کبھی کوئی ماسٹر بدرالدین سے کہتا بھی کہ وہ اِن سب کاموں کا معاوضہ خود اپنی مرضی سے طلب کرے تو وہ نہایت سعادت مندی سے کہتا!

''ہم جی ہی کتنے ہیں دو ہم میاں بیوی اور ایک ہماری دھی رانی''۔

ماسٹر بدرالدین کی دھی رانی اللہ کی کاریگری کا انمول شاہکار تھی جو بھی ایک بار دیکھ لے اپنا رستہ ہی بھول جائے پورے چاند کی چاندنی میں گھوندا رنگ روپ اور شبنم کے قطروں جیسی کومل اور پاکیزہ مگر رات کے پچھلے پہر جیسی خاموشی تھی اُس کے لودیتے حسن میں۔

ہیر پیدائشی قوت سماعت اور قوتِ گویائی سے محروم تھی مگر اُس کی آنکھیں بولتی تھیں۔ لیکن آنکھوں کی بولی صرف دل والے ہی سن سکتے ہیں۔ اِسی خاموشی کے سبب وہ سنگِ مرمر کا مجسمہ نظر آتی۔

اِسی سنگ مرمر کے مجسمے کا اسیر ہو گیا تھا۔ چودھری شیر جان کا بیٹا آذر۔ آذر کا قد کاٹھ دیکھ کر ایسا لگتا جیسے یہ ہیر کے لئے اِس دھرتی پر آیا ہے۔ آذر اپنے بچپن ہی سے اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح پردیس میں رہتا تھا۔ گاوں تو وہ شاذ و نادر ہی آتا تھا۔ اِس بار آذر کئی برس بعد اپنے گاؤں آیا تھا۔ ہیر کو پہلی بار مائی رحمتے کے مزار پر دیکھا تھا وہ مائی رحمتے کے مزار پر دیا جلانے آئی تھی، اوراب دعا مانگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے سر پر سلیقے سے دوپٹہ اُڑھے نجانے وہ اپنے رب سائیں سے کیا مانگ رہی تھی۔ مگر آذر اُسے دیکھ کر ایک لمحے کو سب کچھ بھول گیا۔ اُسے ایسا لگا جیسے کوئی سنگ مرمر کا مجسمہ ہے جو یہاں استادہ ہے جس نے اپنے ساتھ ساتھ اُسے اور اِس ساری کائنات کو بھی ساکت کر دیا ہے۔

اچانک ہیر نے آنکھیں کھول دیں تو آذر کو لگا جیسے محبت کے دیوتا کو آنکھیں مل گئی ہوں۔ اُف کتنی خوبصورت آنکھیں آذر سوچنے لگا آج تک محبت کا دیوتا شاید اِسی لیے اندھا تھا۔ محبت کی آنکھیں ایسی ہی ہونی چائیں۔ جگمگ جگمگ کرتیں گدگداتیں باتیں کرتی، گہری سمندر جیسی نیلی آنکھیں جن میں پورے چاند کا عکس آکر ٹھہر گیا ہو اپنی طرف آواز دیتی پُرسرار مخمور آنکھیں

آذر کو اتنی محویت سے اپنی جانب دیکھتے ہوئے ہیر اپنے اندر ہی سمٹ گئی۔ جیسے چھوئی موئی کے پتے چھونے سے اپنے اندر سمٹ جاتے ہیں۔ آذر کسی غیر مرائی قوت سے ہیر کی جانب بڑھا اور اس کے بہت قریب آکر کھڑا ہو گیا کہ ہیر بھی کسی انہونی کشش کے باعث اپنی جگہ جامد تھی کہ آذر کی سانسوں کی سرگوشیاں اُس کے دل پر دستک دینے لگی تو جیسے اُسے ہوش آ گیا وہ حیران ہو کر وہاں سے جانے لگی آذر اُسے آوازیں دینے لگا

''سنو رُک جاؤ''

''میری بات تو سنو!''

''سنو کون ہو تم''

مگر وہ تو اپنی دھن میں چلے جا رہی تھی۔

''چھوٹے سرکار یہ گاؤں ہے آپ کیا کر رہے ہیں یہاں ایسے نہیں کیا جاتا'' کمدار کے بیٹے مشتاق نے اُسے ٹوکا۔

پھر مشتاق نے ہی آذر کو ہیر کے بارے میں تمام تفصیلات سے آگاہ کیا کہ وہ ماسٹر

بدرالدین کی اکلوتی بیٹی ہے وہ خوبصورت تو ہے مگر پیدائشی گونگی بہری ہے لوگ کہتے ہیں اس پر پریوں کا سایہ ہے وہ صرف اِن کی آواز سنتی ہے اور اُنہی سے باتیں کرتی ہے، اکیلے میں ہنستی بھی ہے۔ اِس کی چپ سے ڈر لگتا ہے سب کو، میری بے بے کہتی ہے دیکھنا ایک دن پریاں ہی اِسے لے جائیں گی۔

آذر ہیر کے بارے میں یہ سب جان کر دکھی ہو گیا۔ لیکن محبت کرنے والے اپنے صنم کو اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ جب بھی کوئی محبوب کسی کو صنم کے منصب پر فائز کرتا ہے تو محبت اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے پھر صرف حسن ہی اس کے ہم رکاب نظر آتا ہے۔ آذر بھی ہیر کو اپنے دل کے سنگارسن پر بیٹھا کر اس کی پرستش کرنے لگا۔

اس سے پہلے کہ آذر کے عشق کی مشک ہواؤں کے دوش پر گنگناتی اور سب پر عیاں ہوتی ایک حادثہ ہو گیا کہ ہیر چودھری شیر جان کی نظر میں آ گئی۔ اُس دن شیر جان اپنے منشی کے ساتھ شہر سے آ رہا تھا کہ گاؤں کے کچے راستے پر ہیر اپنی دھن میں مگن چلی جا رہی تھی شیر جان اپنی جیپ خود چلا رہا تھا۔ بہت ہارن دیئے مگر ہیر سن سکتی تو سنتی چودھری صاحب نے بریک لگائی مگر جیپ رُکتے، رُکتے بھی ہیر سے ٹکرا گئی۔ ہیر گر کر بے ہوش ہو چکی تھی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اس وقت آس پاس لوگ نہ تھے چودھری نے ہیر کو منشی کی مدد سے جیپ میں ڈالا اور ڈیرے پر لے آئے۔

منشی نے ہی چودھری کو بتایا کہ یہ مولوی بدرالدین کی گونگی بہری بیٹی ہے۔ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر اِس کا گھر ہے مگر نجانے کیوں چودھری صاحب اُسے یہاں لے آئے۔

بظاہر ہیر کو کہیں بھی چوٹ نہ آئی تھی بس خوف کی وجہ سے بے ہوش تھی اور چودھری شیر جان خوبصورت جوان بے ہوش ہیر کو دیکھ دیکھ کر اپنے ہوش کھو رہا تھا اچانک ہیر نے آنکھیں کھول دیں سامنے چودھری شیر جان کو دیکھ کر گھبرا گئی اور ایک دم اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔

چودھری شیر جان اُسے ہوش میں آتا دیکھ کر ایک لمحے کو خود بھی ہوش میں آ گیا۔

چودھری شیر جان نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا لڑکی گھبراؤ نہیں تم ٹھیک ہو ابھی تمہیں گھر پہنچا دیتے ہیں اس وقت رات ہو گئی ہے تمہارا اکیلے جانا ٹھیک نہیں۔ ہیر خاموش تھی اور حیرانی سے چودھری صاحب کو دیکھتی رہی۔

'دیکھو ڈرو نہیں یہ کہتے ہوئے چودھری شیر جان اُس کے اور قریب آ گئے۔ ہیر نے اپنے منہ اور کان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نفی میں سر اور ہاتھ ہلا دیے۔

ڈری سہمی خوفزدہ خوبصورت جوان لڑکی اور چودھری کا ویران ڈیرہ باہر بیٹھے چودھری کے وفادار ملازم۔ یہی وہ لمحہ تھا جب چودھری کا احساسِ حاکمیت اُس کی بشریت پر حملہ آور ہوا۔ نفس نہ صرف یہ وار سہہ گیا، بلکہ پلٹ کر وار کرتے ہوئے دل کو حصول خواہش کا مسکن بنا گیا۔ نفس اور دل کی دھمال نے مل کر چودھری کو لمحہ موجودہ کا ایسا اسیر کیا کہ کمزور اور بے بس ہیر ہزار ہا کوشش کے باوجود اپنی عزت کے دامن کو تار تار ہونے سے نہ بچا سکی زندگی میں پہلی بار اپنی بے بسی پر مر جانے کی تمنا کی۔

نفس اور دل کی مان مانی پوری ہوئی تو چودھری کو احساس ہوا کہ اب اِس معاملے کو چھپانا بھی ہے اُس نے اپنے وفادار ملازم کو آواز دی۔ بخشو حکم کا غلام اپنے مالک کی ہر بات ماننے کو تیار ہو گیا کہ اسے کیسے اپنے مالک کے نمک کا حق ادا کرنا ہے چودھری مطمئین ہو کر اپنے گھر جانب چل دیا۔

بخشو جب کمرے میں آیا تو ہیر اپنی بربادی پر بے آواز ماتم کر رہی تھی۔ اب اُسے دیکھ کر وہ پھر سے خوف زدہ ہو گئی بخشو جونہی اُس کی جانب لپکا وہ اسے دھکا دے کر کمرے سے باہر کی جانب بھاگی مگر باہر تو دو ملازم اور بھی موجود تھے۔ جو بخشو کی آواز پر اُسے دبوچنے کو لپکے ہیر کو کچھ نہ سوجھا تو وہ ڈیرے کے کنویں کی منڈیر پر چڑھی اور دوسرے ہی لمحے کنویں میں کود گئی یہ سب اتنا آناً فاناً ہوا کہ کسی کی بھی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

ہیر کو کنویں سے جلد از جلد نکالنا بہت ضروری تھا۔ جو کہ گاؤں والوں کی مدد کے بغیر ناممکن تھا اور اگر وہ ہیر کو کنویں ہی میں مرنے کے لیے چھوڑ دیتے تو بھی وہ لاش کو زیادہ وقت کے لئے چھپا نہیں سکتے تھے کہ کھوجی کھوج لگاتے لگاتے کنویں تک پہنچ ہی جاتا پھر تو اور بھی مشکل ہو جاتی۔

آخر کار گاؤں والوں کی مدد سے ہیر کو کنویں سے نکالا گیا۔ مگر کنویں سے ہیر مردہ حالت میں نکلی مقدمہ چلا، چودھری کے ڈیرے کے کنویں سے ہیر کی لاش کا برآمد ہونا اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اُس کی آبروریزی کے شوائد ملنا چودھری کو کٹہرے میں کھڑا کر گئے۔

مگر واہ رے قانونی سقم کیسے دولت مندوں کے گناہ پر چادر ڈال دیتے ہیں لگتا ہے جیسے یہ سقم چھوڑے ہی اسی لیے گئے ہیں کہ اُن کے خریدار باؤ تاؤ کر سکیں۔ چنانچہ بخشو اور دوسرے دونوں ملازموں نے تین تین کنال زمین لے کر گواہی دے دی کہ ہیر خود چل کر چودھری کے

ڈیرے پر آئی تھی اور اشاروں سے بتا رہی تھی کہ اُس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے چودھری صاحب مجرم کو پکڑیں اور سزا دیں جبکہ چودھری صاحب نے انکار کر دیا بلکہ وہ اُسے یہ سمجھا رہے تھے کہ پہلے اپنے گھر والوں کو بتاؤ اور اِن کے ساتھ آؤ ورنہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔ چودھری کا انکار سن کر اُس نے ڈیرے کے کنویں میں کود کر خودکشی کر لی۔

بخشو نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی گواہی دی۔ اِس وقت کورٹ کے احاطے میں ماسٹر بدرالدین بھی موجود تھا۔ جس کی نظریں قرآن پاک پر جمی ہوئیں تھیں اور وہ دل ہی دل میں اس کتاب کے مالک سے مدد مانگ رہا تھا اور یہی دعا کر رہا تھا جیت حق کی ہو کہ فیصلہ آیا کہ چودھری کے خلاف کوئی گواہ موجود نہیں جبکہ ہیر کی خودکشی کے حق میں تین تین ملازموں کی گواہی موجود ہے۔

عدالت کے فیصلے کے بعد چودھری سب سے پہلے بدرالدین کے پاس آیا اور اپنی ہر طرح کی مدد کا یقین دلانے لگا۔ ایسے میں بدرالدین کو بھی ایک لمحہ ایسا لگا جیسے چودھری ٹھیک ہی کہہ رہا ہے کہ اچانک بخشو چکرا کر کورٹ کے احاطے میں گر پڑا۔ لوگوں نے بخشو کو سہارا دے کر اُٹھایا مگر اُس کی گردن مسلسل نفی کی گردان میں ہل رہی تھی۔ اپنی حالت پر بخشو خود بھی حیران و پریشان تھا۔ اب گاوں کے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ بخشو نے جھوٹی گواہی دی ہے مگر چودھری کے ڈر سے یہ بات کوئی بھی اپنی زبان پر نہ لایا۔

قدرت کی بے آواز لاٹھی برسنے لگی اور وہ زمین جیسے پا کر ایک معصوم کے خلاف جھوٹی گواہی کے مرتکب ہوئے اُسی زمین کو کلر کا کینسر ہو گیا اور ساتھ ساتھ گاوں کے کنوؤں کا پانی بھی کڑوا ہونے لگا۔ آذر کے لئے یہ سب بہت حیران کن تھا۔ وہ کسی بھی صورت ہیر کو بھول نہیں پا رہا تھا۔ اُسے ہیر کے ساتھ ہونے والی زیادتی سے زیادہ اپنی بے بسی کا دکھ تھا کہ وہ اس کے لیے کیوں کچھ نہیں کر پایا۔ وہ گھنٹوں ڈیرے کے کنویں کے پاس بیٹھا رہتا گھر والوں نے بہت سمجھایا مگر جیسے اس کا اپنے آپ پر اختیار ہی نہ رہا ہو۔ آذر نے بہت ضد کر کے ہیر کی قبر ڈیرے میں بنوائی اُس وقت چودھری کو بدرالدین کو یہ باور کروانا تھا کہ میرا ہر طرح کا تعاون تمہارے ساتھ ہے، ہم ضرور اُس کے مجرم کو ڈھونڈ لیں گے۔ لہذا آذر کے اس عمل کو نہ رُک سکا ڈیرے کا کنواں ہیر کی لاش نکالنے کے بعد ڈھک دیا گیا تھا۔

ماسٹر بدرالدین کے گھر کی تمام رونق ختم ہو گئی اب اِن کا گھر ہر وقت سوگ میں ڈوبا رہتا

اُس کی بیوی صغراں ہمہ وقت جائے نماز پر اپنا دامن پھیلائے اپنے رب سے ہیر کے گناہ گار کی عبرت ناک سزا کی دعائیں مانگتی رہتی۔ صغراں کی بد دعائیں لوگوں کو قبول ہوتیں نظر آنے لگیں۔ جب چودھری کی کمر میں ایک پھوڑا نکلا اور آہستہ آہستہ پھیل کر ناسور کی شکل اختیار کر گیا اس کا نچلا دھڑ بے کار ہو گیا۔ اس کے بچے تو پہلے ہی باہر تھے۔ وہ وہیں مگن رہے چودھری کی حویلی سے اب صرف ہائے ہائے کی صدائیں ہی سنائی دیتیں۔

بخشو اپنی گردن کے نہ ٹھہر پانے اور زمین کے سفید ہونے پر پاگل سا ہو گیا زمین پر جاتا تو مٹی اُٹھا اُٹھا کر اپنے سر میں ڈالنے لگتا کبھی زمین پر ناک رگڑنے لگتا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر گاؤں کے لوگ توبہ توبہ کرنے لگتے۔ پہلے سب مقدمے میں الجھے ہوئے تھے پھر زمین کا سیم وتھور زدہ ہونا اور اب تیزی سے کنووں کے پانی کا کڑوا ہونا ہر کوئی ہی فکر مند اور پریشان تھا کل کے اندیشے سر اُٹھا رہے تھے۔

پھر آدمیت کی سنت پر عمل کرتے ہوئے آہستہ آہستہ لوگوں نے گاؤں سے ہجرت کرنی شروع کر دی کسی دوسرے گاؤں کی طرف اپنے گناہوں کا بوجھ اپنے سروں پر اُٹھائے یہاں سے نکل کر کسی دوسری بستی میں پناہ ڈھونڈنے۔

سب کے بہت سمجھانے پر ماسٹر بدرالدین اور صغراں بھی ہجرت پر تیار ہو گئے مگر صغراں کی ضد تھی کہ پہلے بیٹی کی قبر پر جاوں گی ماسٹر بدرالدین صغراں کو چودھری کے ڈیرے پر لے آیا جوان بیٹی کی قبر دیکھ کر صغراں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور بے ہوش ہو گئی۔ آذر کو کچھ نہ سوجھا تو اس نے کنویں کا ڈھکن ہٹا کر پانی نکالا اور چاچی صغراں کو پلایا۔ چاچی صغراں پورا پانی پی گئی اور چیخنے لگی یہ پانی تو میٹھا ہے سب لوگ سمجھے یہ بیٹی کے غم میں پاگل ہو گئی ہے، اور کسی نے بھی اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ وہ چیختی رہی پھر سب لوگ اُسے زبردستی لے کر چلے گئے۔

آذر جانتا تھا کہ چاچی صغراں سچ کہہ رہی ہے کیونکہ وہ وہی پانی روز پیتا تھا۔ جبھی تو زندہ تھا۔ اُس کی ہیر کی جان بسی تھی۔ اُس پانی میں کسی کو بتا کر وہ کیسے اپنے اور ہیر کے بیچ لوگوں کو لے آتا کہ اِن خاموشیوں میں اُسکی ہیر گنگناتی تھی۔

آذر ہر روز اِس کنویں سے پانی نکالتا مٹی گوندتا اور دن بھر مٹی سے محبت کا دیوتا بناتا مگر جب آنکھیں بنانے لگتا تو دو آنکھیں اُس کے وجدان میں اپنی چھبی دیکھانے لگتیں، خاموش لیکن بہت کچھ کہتی ہوئی، جگمگ جگمگ کرتی، گدگداتی ہوئی، اپنی طرف آوازیں دیتیں، پر سرار، مخمور،

نیلی آنکھیں جن میں پورا چاند آ کر ٹھہر گیا تھا۔

وہ اپنا کام چھوڑ کر اُن میں کھو جاتا۔ اِن سے جی بھر کے باتیں کرتا پھر وہ ہوش وخرد سے بے گانہ اُن آنکھوں سے کھیلتا رہتا۔ ہوش آتا تو دن بیت چکا ہوتا اب بھلا رات کے پچھلے پہر اندھیرے میں وہ آنکھیں کیسے بنائے، محبت کے دیوتا کا وہ اندھا مجسمہ بنا آنکھوں کے پھر اُدھورا ہی رہ جاتا۔ مگر پچھلے پہر کی خاموشی چار سو فضاؤں میں محبت کا پاکیزہ گیت گنگناتی رہتی۔

☆☆☆
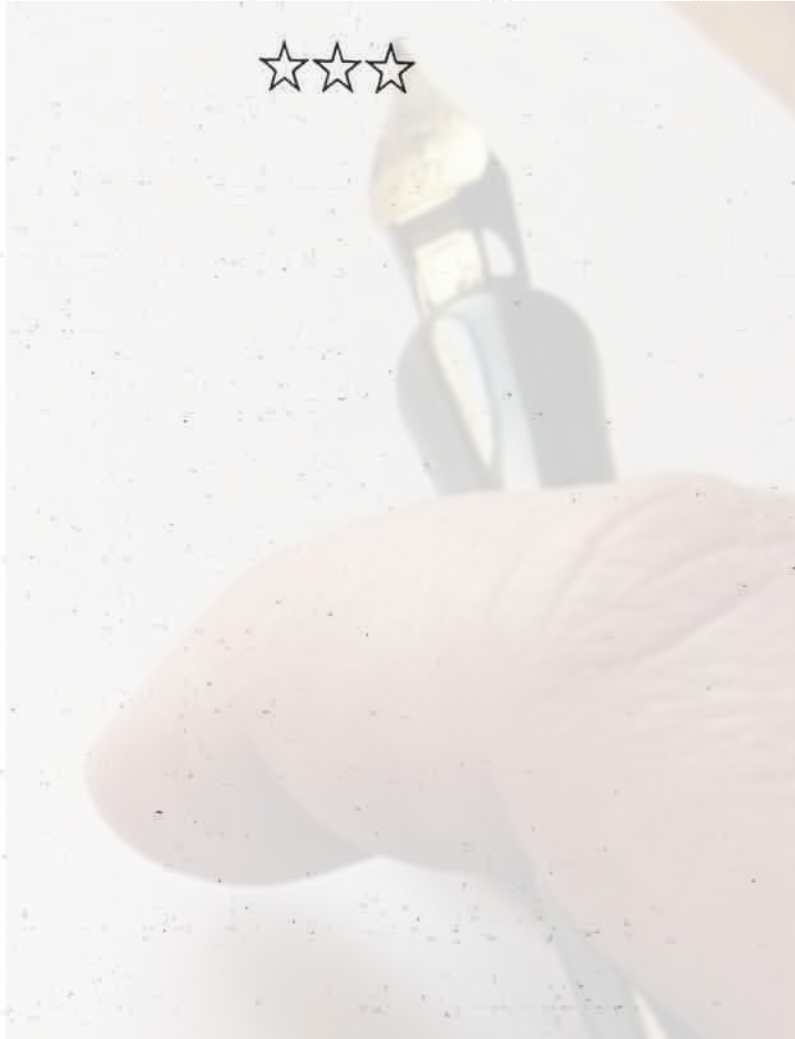
گروی رکھی آنکھیں

فضاء میں تعفن بہت بڑھ گیا ہے۔۔

ہر ایک نے اپنے ناک پر ایک ماسک پہن لیا۔ اِس سے اب پہچان بھی مشکل ہونے لگی، مگر اِنہیں چہروں میں کچھ اُدھ جلے چہرے بھی ہیں۔

تیزاب نے اُن چہروں کو کچھ اِس طرح مسخ کیا کہ ناک کے دونوں نتھنے آپس میں جڑ گئے، اب وہ تعفن سے چھٹکارا پا چکے ہیں۔ چہرے اپنے نقوش کھو کر گو کہ بد ہیبت ضرور ہو گئے ہیں مگر اپنی قوت شامہ کے مرجانے سے وہ اِس تعفن زدہ ماحول میں بھی پر سکون ہیں۔۔

یہ کیسا سکون ہے؟ ۔۔

اِسی ماحول میں بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ وہ سب ڈی چوک کی طرف جا رہے تھے پھر اُنھوں نے باغ کے بیچوں بیچ ایک پتھر کا مجسمہ استادہ کر دیا۔ یوں تو اُس مجسمے میں کوئی بھی انوکھی بات نہ تھی۔ اُس کی تراش خراش بھی پہلے مجسموں جیسی ہی تھی، مٹی بھی اِسی پہاڑ سے لی گئی تھی ہاں مگر اُس پتھر کے مجسمے کے منہ میں ایک لمبی سرخ زبان تھی اور وہ زبان کہانیاں بھی سنانے لگی بہت رنگین کہانیاں خوابوں سے بھری، کامیابی کی طلسماتی کہانیاں۔۔۔۔

خاکی وردی پہنے ہاتھوں نے خود ہی اِس سرخ مٹی سے بنے مجسمے کے گلے میں تازہ پھولوں کے ہار بھی ڈال دیے۔ ایک لمحے کو ہوا کا ایک جھونکا آیا اور فضاء کو معطر کر گیا۔ مگر اگلے ہی لمحے پھر وہی تعفن زدہ ماحول رہ گیا۔ وہ پتھر کا مجسمہ پتھر ہی نکلا گو کہ حکم تھا کہ اس کے گلے میں روز

تازہ پھولوں کے ہار ڈالیں جائیں۔ لیکن اتنے پھول کہاں تھے اس بستی میں۔ ماحول کی آلودگی دن بدن پھولوں کو کملا رہی تھی۔

سو آہستہ آہستہ چمن اجڑنے لگا۔

پنکھ پکھرو ہجرت کرنے لگے جورہ گئے، وہ بھی اپنے گیت بھول چکے تھے، پرندے اپنے گیت اُس وقت گاتے ہیں جب وہ اونچی اُڑان بھرتے ہیں۔ اِن گیتوں میں دراصل اُن کی اُونچی اُڑان کی داستانیں رقم ہوتی ہیں۔ جو وہ سرشاری میں سناتے ہیں، مگر اب اُن کے پر اُونچی اُڑانوں کی سکت کھو بیٹھے ہیں تو گیت بھی اپنے آپ مر رہے ہیں اِسی لئے ہوائیں بھی سوگوار ہیں۔

بستی کی ساری مائیں اپنے اپنے دروازوں پر بیٹھی انتظار کھینچ رئیں ہیں ایک ایسا انتظار جو اُمید اور نا اُمیدی کے جھولے میں جھول رہا ہے۔ اُن کی چادر میں اتنے چھید ہو چکے ہیں کہ اب اُن کے آنسوؤں کو بھی امان نہیں ملتی۔ کبھی کبھی جب زمیں خود ہی بے رحم ہو کر ہڈیوں کو اُگل دیتی تو خشک آنکھیں آسمان کی جانب اُٹھ کر خاموش سوال کرنے لگتیں تب ہی اُن کی کوکھ میں درد کا ایک آتشی گولہ گردش کرنے لگتا جو اِن ہڈیوں سے اپنے رشتے کی گواہی دے دیتا۔

چلتے پھرتے سائے رہ گئے ہیں جو بچی کھچی آکسیجن اپنے اندر بھرتے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ میں بدل کر خارج کر دیتے آنکھوں کے دیئے خوابوں سے بے نور بجھے بجھے سے ہیں اب آنکھیں کوئی خواب نہ دیکھ پائیں اسی لیے اُن سے اُن کی نیندیں گروی رکھوالیں گئیں ہیں۔

کانوں میں پڑی ہر آواز پر اسرافیل کے صور کی صدا کا گمان ہوتا ہے۔ دل و دماغ نے نے ان آوازوں پر ردِ عمل دینا چھوڑ دیا ہے۔ اب گونگی سماعتوں نے سروں کا انتظار بھی چھوڑ دیا ہے اب کوئی بھی سر تال کی لہہ ہی نہیں ہے۔ بے ہنگم شور ہے۔ جو چاروں طرف گونج رہا ہے اور ساری آوازئیں گڈ مڈ ہو گئیں ہیں۔

ان آوازوں میں۔۔۔

ننھی ننھی نوخیز بچیوں کے نوچے ہوئے بدن کی چیخیں ہیں۔۔۔

کمسن، نوعمر لڑکوں کے کراہنے کی آوازیں ہیں۔۔۔

پچھلے پہر کی خاموشی

کنواری لڑکیوں کی مدھم سسکیاں اور آہیں ہیں۔۔۔

بیماری اور درد میں پل پل زندگی کو الوداع کرتے جسموں کی ہائے ہائے ہے۔۔۔

اور !

کوکھ میں مردہ بچہ لیے زندہ ماں کو موت کی سنائی دیتی چاپ ہے۔۔۔

زندہ ذہنوں کو بدگمانیوں کے دیمک چاٹ رہے ہیں۔ نا اُمیدی کا کفر اپنا گھیرا تنگ کر رہا ہے ایسے میں شاہی فرمان آیا اب کوئی بھوکا نہیں سوئے گا۔۔۔

ہنر اپنا رستہ موڑنے لگا ہے، اوزاروں پر زنگ کی موٹی تہہ جمنے لگی ہے۔ مقید ذہنوں کے بدن مفلوج ہونے لگے۔ اب جسم گھسٹ گھسٹ کر کھسکنے لگے راستہ بہت طویل لگنے لگا کہ صدا آئی من وسلویٰ مل جائے گا۔۔۔

مصلحت ناچنے لگی مگر اپاہج ہوتی سوچ سے پھر بھی نہ رہا گیا اور وہ سوال کرنے لگی!

گر اِس سے شکم بھر بھی لوں تو کیا میری آنکھوں کو وہ نیندیں ملیں گی کہ جن کی رسائی اُن خوابوں تک ہو گی جو تعبیریں پا سکیں، سماعتوں کو رسیلے نغمے اور لہو گرماتے گیت، دل میں محبت بھرے جذبے اور اُمنگیں، اور کیا دماغ میں تدبیریں اور تفسیریں جنم لیں گیں۔۔

مگر اِس شکم پُری کی دستک ہی نے زبان سے لفظ اور لفظوں سے تاثیر چھین لی کہ جب کالی چیل نے جھپٹ کر تین بچوں کے سر سے آناً فاناً ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت چھین کر خزاں رسیدہ شجر سے بچھڑے پتے کی طرح ہوا کے دوش پر تنہا چھوڑ دیا۔

دیکھا تو سب نے۔۔

اور سمجھا بھی سب نے۔۔۔

مگر اچانک آنکھوں دیکھے منظر بدل گئے۔۔

زیر زبر، شین قاف سب تبدیل کر دیے گئے اور قیامت کی مثال کچھ اس طرح واضح ہو گئی کہ۔۔

خام کو جام بنا دیا گیا

یہ جام سب کو بانٹ دیا گیا

پھر اِس جام کے نشے میں سب بدمست ہوکر ناچنے لگے اور نا کہنا بھولا بیٹھے۔

اب نجانے یہ تماشہ کب ختم ہوگا۔۔۔

اور نہ چاہتے ہوئے بھی یہ تماشہ دیکھنا ہوگا کہ سہنری تعبیروں والے خوابوں کے غوض ایک مہر ثبت کر کے ہم نے اپنی آنکھیں گروی رکھوادیں ہیں۔

ہونٹوں سے گرتی دعا

درزی اپنی دوکانیں کھول سکتے ہیں۔لاک ڈاون میں یہ اعلان سن کر ریاض درزی خوش ہوگیا۔دوسرے دن صبح صبح وہ تیار ہوااور اپنی دوکان پر چلا گیا۔پچھلے ایک ماہ سے بند دوکان کی پہلے توصفائی کی۔مشینوں کو صاف کیااور تیل ڈال کر رواں کیا۔

پورا شہر بند تھا۔اسکول،کالج،یونیوسٹیاں اور تمام دفاتر بھی سب بند تھے صرف اجناس کی خرید وفروخت ہورہی تھی۔کورونا کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔میڈیا کی ہیبت ناک آوازیں چارسو گونج رہیں تھیں۔ہر شخص اپنے طور پر فکر مند تھا۔جن لوگوں نے ماضی میں پھیلنے والی وباؤں کے بارے میں پڑھ رکھا تھا یا جانتے تھے وہ زیادہ فکر منداور پریشان تھے۔

ایسے میں مفروضات اورافوائیں بھی خوب پھیل رہیں تھیں۔کوئی اسے انسانی حاکمیت کی سازش گردان رہا تھا تو کوئی اس کے در پردہ ملنے والے فوائد کی باتیں کر رہا تھا۔حکومتی سطح پر قرنطین سینٹر قائم کیے جا چکے تھے۔اس وبا کے شکنجے میں جکڑے جانے والے علاج کے لیے قرنطین کردیے جاتے۔عالمی سطح پر بھی خبریں اورافوائیں ساتھ ساتھ سفر کر رہیں تھیں۔ماحول میں آنے والی موت کے طوفان کی بو تھی۔جس کے پیش نظر حکومتی سطح پر لاک ڈاون کروا کر سب ہی کو اپنے اپنے گھروں میں رہنے پر پابند کردیا گیا تھا۔

۱۹۲۰ میں ہندوستان میں طاعون پھیلا تھا۔اُس وقت اور اب کے وقت میں زمین آسمان کا فرق آچکا تھا اُس وقت تو لوگ جدید سہولیات سے بھی نا آشنا تھے مگر انھوں نے اپنے اپنے گھروں میں خود ساختہ قید ہی سے اِس مرض سے چھٹکارا پایا تھا۔چنانچہ آج بھی اس سے پہلا بچاو ہر شخص کا اپنا گھر ہی بتایا جارہا تھا۔لوگ اپنے اپنے گھروں میں رہتے رہتے اکتا گئے تھے کہ سب

کام جہاں تھے وہیں روک گئے تھے۔اب تو بس یہ عالم تھا کہ جب نیند آتی سو جاتے آنکھ کھلتی تو جاگ جاتے، بھوک لگتی تو کھا لیتے، ٹی وی، انٹرنیٹ اور موبائل یا جو مطالعے کے شوقین ہیں وہ کتب بینی کرتے نہ کسی کو کہیں جانے کی جلدی نہ ہی کسی کے آنے کا انتظار۔زندگی کوما کے مریض کی طرح کی ہو کر رہ گئی تھی۔

تنخواہ داروں کو تو تنخواہ مل گئی تھی انہیں بس اجناس اور روز مرہ کے استعمال کی اشیاء کی فراہمی کی فکر تھی مگر دھاڑی دار یا اپنا چھوٹا موٹا کام کرنے والوں کی فکر جدا تھی۔انہیں میں ریاض درزی اور اس کا خاندان تھا، چار بچوں، بوڑھے والدین اور خود دو میاں بیوی، آٹھ لوگوں کا کھانا پینا اور بوڑھے والدین کی دوا دارو بھی۔کھلا خرچ تو وہ پہلے بھی نہ کر سکتے تھے اب تو حالات اور بھی کشیدہ ہو گئے ایسے میں آمدنی کا در بند ہو جانا فکر و پریشانیوں کے دوسرے در کھول رہا تھا، جمع پونجی بھی خرچ ہونے لگی اور اچھا بُرا وقت کٹنے لگا۔

وبا بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی رفاعی ادارے کی رپورٹ کے مطابق روزانہ تیس چالیس اموات ہو رہیں تھیں گویا موت رفتہ رفتہ اپنا دائرہ بڑھا رہی تھی۔

صرف ابا جی کی پینشن تھی جوان حالات میں بھی ملنے کی اُمید تھی مگر وہ تھی ہی کتنی پھر امی ،ابا دونوں کی اپنی ضروریات اور ادویات بھی تھیں۔

ریاض کا کام کرنا بہت ضروری تھا۔اُس کی دکان میں دو ملازم لڑکے بھی تھے جو اِس گھڑی میں ریاض کی طرف دیکھ رہے تھے۔ریاض جیسے تیسے اُن کی مدد بھی کر رہا تھا۔مگر آخر کب تک بے کار بیٹھ کر کھانے سے تو قارون کا خزانہ بھی ساتھ نہیں دیتا یہ تو پھر ریاض درزی کی دکان کا غلہ تھا۔

حکومت کی طرف سے درزیوں کی دکان کھولنے کا اعلان کیا ہوا گویا ریاض درزی کو چلتی مشین کی موسیقی سنائی دینے لگی جو اس کی روح کو زندگی بخشنے لگی۔

ایکا دُکا دوکان کے سامنے سے گزرنے والے لوگ ریاض کو دوکان میں اتنا منہمک دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔مگر وہ چپ چاپ اپنا کام کر رہا تھا۔دو چار گھنٹے لگا کر اُس نے نہ صرف دوکان کو سمیٹ سماٹ کر صاف کر دیا بلکہ اپنے ملازمین لڑکوں کو بھی موبائل کر کے بلا بھیجا۔اب وہ اپنی دوکان میں بیٹھا اپنے اُس کپڑا فروش کاروباری دوست اجمل کا انتظار کر رہا تھا جس کی دوکان سے وہ اکثر عید تہوار کے دنوں میں اپنے مستقل گاہکوں کے لئے کپڑا خرید اکرتا تھا۔

کچھ ہی دیر میں اجمل آ گیا ریاض درزی نے اُس سے سفید کورے لٹھے کا سودا کیا ۔اجمل کپڑے والا بھی ریاض کو اُدھار کپڑا دینے پر راضی ہو گیا کہ نجانے کب مارکیٹیں کھولیں اور کب خرید وفروخت شروع ہو گی ۔حالات تو اس طرف جاتے نظر نہیں آتے گودام میں پڑے رہنے سے تو بہتر ہے ریاض درزی کو اُدھار پر ہی فروخت کر دیا جائے ترسیل کا ذمہ بھی خود لے کر اجمل کپڑے والے نے ریاض درزی کی مشکل بھی حل کر دی۔

دوسرے دن سے ریاض درزی دوکان پر بیٹھ کر کام کرنے لگا اور اس کے دونوں ملازم لڑکے بھی باری باری اُس کی دوکان پر آتے اور کٹا ہوا سامان لے جاتے اور دوسرے دن تیار کر کے اُسے دے جاتے۔

یہ تمام تیار مال ریاض درزی ایک فلاعی ادارے کو دے کر اپنی قیمت لے آتا یوں نہ صرف اس کی گاڑی چلنے لگی بلکہ اجمل کپڑے والے اور اس کے دو ملازموں کی گھر کی گاڑی کا پہیہ بھی گھومنے لگا۔

اُس دن بھی وہ ناشتا کر رہا تھا اُسے دوکان جانا تھا اُسکی بیوی اُس کے پاس بیٹھی ادھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی ان کی دونوں بیٹیاں قریب ہی فرش پر بیٹھی کھیل رہیں تھیں کہ آپس میں جھگڑ پڑیں بڑی بیٹی چھوٹی بہن سے کہہ رہی تھی کہ 'تم نے بے ایمانی کی ہے اب میں تمہارے ساتھ نہیں کھیلوں گی ۔جبکہ چھوٹی بیٹی بولی 'نہیں میں نے کوئی بے ایمانی نہیں کی مجھے معلوم ہے کہ بے ایمانی سے دعائیں قبول نہیں ہوتیں ۔ریاض اور اُس کی بیوی اُٹھ کر دونوں بیٹیوں کے پاس وہیں فرش پر بیٹھ گئے ۔ریاض نے اپنی چھوٹی بیٹی کو پیار کرتے ہوئے شاباش دی اور پوچھا اچھا تو میری بیٹی کی دُعائیں قبول ہوتیں ہیں۔

چھوٹی مسکراتے ہوئے بولی

''ہاں بابا میں روز آپ کے لئے دُعا مانگتی ہوں میری دُعا قبول ہوئی جبھی تو آپ کو کام ملا سب کے ابو آج کل گھر پر ہیں مگر آپ دوکان جاتے ہیں اور سلائی کرتے ہیں ۔اللہ میاں آپ کے کام میں بہت بہت برکت دے''

چھوٹی نے اپنی دونوں بانہیں پھیلا کر دعا مانگنی چاہی مگر ریاض نے اچانک اپنی بیٹی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُس کی دُعا ادھوری کر دی۔۔۔۔۔

☆☆☆

سٹنٹ

''نہ! نہ! دھی رانی کبھی یہ سوچنا بھی نہ!
بڑی زمیندارنی نے ریشم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے سمجھایا۔

''نہ تو اماں پھر میں کیا کروں سائیں جی کو چپ چاپ دوسری شادی کی اجازت دے دوں؟''

ریشم نے بے چین ہوکر پوچھا۔

''دیکھ بیٹی جب مرد دوسری شادی کی خواہش کا اپنی زبان سے اقرار کرلے تو سمجھو کہ بہت دیر ہو چکی ہے۔ وہ اپنے دل کی دنیا کہیں بسا بیٹھا ہے اب تو بس حق شرح کی چادر اُڑا رہا ہے۔ تجھے ہمت سے کام لینا ہوگا۔ اگر جذباتی ہوکر سوچے گی تو جو ہاتھ میں ہے وہ بھی گنوا دے گی''۔

''اماں اب بچا ہی کیا ہے؟'' ریشم نے بے چین ہوکر پوچھا۔

''ابھی بھی تیرے پاس بہت کچھ ہے۔ تو راول کے دو، دو بیٹوں کی ماں ہے۔ ذرا ہمت سے کام لے گی تو اپنا اور بچوں کا مستقبل بچا لے گی اور بیٹوں والی ماں کا وقت ضرور آتا ہے اِس وقت کو گزار لے گی تو اچھا، ورنہ تیرا خسارہ ہی خسارہ ہے''۔ ماں نے بیٹی کو دور اندیشی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اماں بابا اور بھائی ہیں نا میرا ساتھ دینے کو!'' ریشم اب اپنے رشتوں کی دوہائی دینے لگی۔

''نہ بیٹی تیرے بھائیوں کے کندھوں پر اب تیری بھابیوں کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے

وہ تیرے کم اور تیری بھابھیوں کے زیادہ ہیں۔اور تیرے بابا۔۔۔تیرے ہی ہیں مگر اب وہ بھی تیرے بھائیوں کا سہارا لے کر اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔وہ جب تیرے بارے میں فیصلہ کریں گے تو اُن کے لفظوں میں تیرے بھائیوں کے الفاظ ہوں گے اور تیرے بھائیوں کے الفاظ میں کچھ رنگ تو اُن کی بیویوں کی گفتگو کا ضرور جھلکے گا''۔

ماں نے روک کر بیٹی کے چہرے سے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اُس کی باتوں کا کچھ اثر ہوا یا نہیں۔

ریشم خاموش تھی، پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''اگر میں یہاں آجاوں سب کچھ چھوڑ کر پھر تو راول سائیں کو میری کمی کا احساس ہو گا؟'

''تو اگر یہاں آجائے گی تو تجھے رہنے کو جگہ اور پیٹ بھرنے کو کھانا بھی مل جائے گا ،سردی گرمی کے موسم میں بچاؤ کے کپڑے بھی مل جائیں گے مگر تیری پہچان کیا رہ جائے گی؟ شوہر کی چھوڑی ہوئی عورت کا خطاب تیرے حصے میں آئے گا۔تو چپ رہے گی تو کہا جائے گا اب پچھتا رہی ہے، ہنسے گی تو لوگ تجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھیں گے جیسے تو کوئی گناہ کر رہی ہے تجھے نہ تو الماری بھرے کپڑے اچھے لگیں گے اور نا ہی بننا سنورنا کیوں کہ اکیلے پن کی جلن،تڑپ اور تنہائی کا عذاب تیرے ساتھ بانٹنے والا کوئی نہ ہوگا''۔

ماں بیٹی کو سمجھاتے ہوئے ایک لمحے کو رکی اور پھر کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ بولیں۔

''تیری سب خوشیاں اُدھوری محسوس ہوگئیں، نئی فصل کی کٹائی پر جہاں سارا گاؤں خوش ہوگا اُس وقت ڈھول پر پڑنے والی تھاپ تجھے اپنے دل پر پڑتی محسوس ہوگی اور گیت کانوں کے رستے تیری آنکھوں کو بھگونا شروع کر دیں ایسے میں الھڑ لڑکیوں کی سرگوشیاں تجھے اپنے بارے میں بات کرتی محسوس ہونگی۔اِن سب کا مداوا نہ میرے پاس ہے اور نہ ہی تیرے بابا کے پاس۔۔۔''

ریشم نے تڑپ کر ماں کی طرف دیکھا اور پوچھا!

''تو اماں میں کیا کروں؟ وہاں رہ کر بھی تو آگ میں ہی جلوں گی۔دوسری عورت کو سوتن کے روپ میں دیکھ دیکھ کر اور سائیں جی کو اُس کے ناز نخرے اُٹھاتے دیکھ کر ہر ہر لمحہ عذاب کا ہوگا اپنی بے وقعتی کا احساس تو وہاں بھی مجھے پل پل مارے گا اور سب سے بڑھ کر ساتھ رہ کر بھی تنہا

رہنا تو اور بھی بڑا عذاب ہے''۔

ریشم یہ سب کہتے کہتے رو پڑی آنسو پھل پھل کرتے آنکھوں کی باڑ سے باہر گرنے لگے اور ممتا کی ماری ماں کے دل کا خون کرنے لگے۔ بڑی زمیندارنی نے آگے بڑھ کر ریشم کو گلے لگا لیا مگر ریشم تو ممتا کی آغوش میں سمٹ کر اور بھی بلک بلک کر رونے لگی۔

''ہمت کر میری بچی یہ تیری لڑائی ہے اور تجھے ہی لڑنی ہوگی'' ماں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اماں آپ بابا سے کہو نا وہ راول سائیں سے بات کرے آخر انھوں نے جہیز میں مربعوں کی زمین میری خوشیوں کی ضمانت کے بدلے ہی تو دی ہے'' ریشم نے رائے دی۔

''ضرور بات کروں گی مگر دھی رانی قسمت کے آگے ہر شے بے قیمت ہے قسمت کی پوٹلی تو تقدیر باندھتی ہے اب وہ جو بھی اس میں باندھ دے قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔

ذوسری شادی کو مرد اپنا حق سمجھتا ہے اور کرنے والا اپنی شان، مرد نہ تو اپنے اس حق سے دستبردار ہونا چاہتا ہے اور نہ اپنی شان سے ۔۔۔ اب تجھے ہی سمجھداری اور صبر سے کام لینا ہوگا ، ماں بن کر سوچ، عورت بن کر سوچے گی تو دل سے ہار بیٹھے گی، کیونکہ عورت کا سب سے بڑا دشمن اس کا اپنا دل ہی تو ہوتا ہے، تو صرف ماں بن کر سوچ، ماں بن کر سوچے گی تو ممتا صبر کا بڑا اور ٹھنڈا گھونٹ پلا دے گی۔۔۔''

ریشم ماں کی باتوں سے مزید پریشان ہوگئی مگر دوسرے دن جب راول نے اُسے لینے ڈرائیور بھیجا تو چپ چاپ اپنے گھر لوٹ آئی۔

وہ جان چکی تھی کہ یہ صرف اُس کی اپنی جنگ ہے اور اُسے ہی لڑنی ہے۔ اب وہ اِس جنگ کو جیتنے کے دوسرے پہلوؤں پر غور کرنے لگی۔

راول اور اس کی شادی آٹھ سال پہلے بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی اور اِن آٹھ سالوں میں وہ بیوی کے منصب سے اعزاز پا کر راول کے دو بیٹوں کی ماں بھی بن چکی تھی۔ دو، دو بیٹوں کی ماں بننے کے بعد اب وہ مطمئن تھی کہ اس کی تھاں پکی ہوگئی ہے۔ مگر آج وہ سوچ رہی تھی کہ یہ میری خام خیالی ہی تھی۔ عورت کی تھاں تو ہمیشہ عورت ہی طرح کچی رہتی ہے۔ جیسے بھر بھری مٹی کو گاڑے کی لپائی جمائے رکھتی ہے اسی طرح عورت بھی معاشرے میں مرد کے نام کے ساتھ اپنی شناخت رکھتی ہے۔ اِس کی اپنی کوئی پہچان نہیں اپنی کوئی بنیاد نہیں وہ کس کی ماں ہے، کس

کی بیوی ہے، کس کی بہن ہے اور کس کی بیٹی ہے۔ ہر ہر رشتے میں مرد کے نام کا گارا ہی اسے مستحکم کرتا ہے۔

گھر آئی تو اس کی پرانی ملازمہ پینو اُس کے پاس آئی اور اپنی ساری معلومات بہت تفصیل سے اُس کے گوش گزار کر دیں کہ راول سائیں کس گھر کی بیری پر پتھر پھینک رہے ہیں۔

پینوں نے اُسے مطلع کیا کہ ماہی کی ماں اپنی خوبصورت جوان بیٹی کے ساتھ اپنے بھائی کے گھر ہی آن بسی ہے۔ سنا ہے اِس کا شوہر شہر میں کسی سیاسی تنظیم کا ایک معمولی کارکن تھا جو کہ مخالف پارٹی کی گولی کا نشانہ بنا اور اللہ کو پیارا ہو گیا۔ سیاسی پارٹی کو تو اُس جیسا دوسرا کارکن مل گیا۔ مگر اس کی اپنی بیوی اور بیٹی کا کوئی پرسانِ حال نہ رہا۔ ماہی کی ماں اپنی بیٹی کو لے کر اپنے بھائی کے گھر آ گئی ماہی کی ماں ایک جہاں دیدہ عورت ہے۔ شوہر کے بڑے لوگوں کے ساتھ تعلقات تھے تو یہ بھی نہ صرف اچھے سے رہتے تھے بلکہ ماہی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم بھی تھی اب ماہی کی ماں اپنی بیٹی کو مورا بنا کر وہ سب حاصل کرنا چاہتی ہے جس کا خواب اُس کا مرحوم شوہر اُس کی آنکھوں میں بسا گیا تھا۔

ریشم کے لیے یہ تمام معلومات بہت اہم تھیں۔ وہ سوچنے لگی یہ ایک بات تو اچھی ہے کہ ماہی پڑھی لکھی ہے میری بات سمجھ جائے گی سنا ہے پڑھی لکھی لڑکیاں کسی کا حق نہیں مارتیں پھر اُس کی ماں ایک لالچی عورت ہے۔ میں خود اُن سے بات کر کے سمجھاؤں گی اگر سمجھ گئیں تو اچھا ہے ورنہ انہیں پیسوں کا لالچ دے کر سودے بازی بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ سوچ کر وہ کچھ مطمئن ہو گئی۔

جس دن ریشم کو پتہ چلا کہ راول سائیں آج کسی ضروری کام سے شہر جا رہے ہیں وہ اُسی دن پینو کے ساتھ ماہی کے گھر پہنچ گئی۔ گاؤں کی اختتامی حدود میں ماہی کا گھر گاؤں کے باقی گھروں سے کچھ مختلف نظر آ رہا تھا۔ ریشم نے اپنے آپ کو لمبی چادر میں اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا کہ وہ آسانی سے پہچانی نہ جا سکے، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ راول سائیں نے اپنے کسی نہ کسی وفادار کو اُس گھر کی چوکیداری کے فرائض ضرور سونپے ہونگے۔

ملازمہ انہیں بیٹھک میں بیٹھا کر اطلاع کرنے چلی گئی ریشم نے اپنے آپ کو ماہی کی یونیورسٹی کی جان پہچان کا بتایا تھا۔ ماہی کے انتظار میں اُس کی نظریں کمرے کا جائزہ لینے لگیں کھوجتی نظروں نے کھوج ہی لیا کہ گلدان میں جو پھول سجے ہیں وہ اُس کے باغیچے کے ہیں۔

کچھ دیر میں ماہی کمرے میں داخل ہوئی صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ ابھی ابھی سو کر اُٹھی

ہے اُس کی آنکھیں نیند ادھوری رہ جانے کی چغلی کھا رہیں تھیں ۔ ریشم ماہی کو غور سے دیکھنے لگی اور اُس کا موازنہ اپنے آپ سے کرنے لگی۔

جبکہ ماہی کے انداز میں اجنبیت تھی اُس نے ریشم سے کہا!

''معاف کیجیے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں''۔

ریشم نے بغیر کسی تاثر کے کہا!

''میں سائیں راول کی بیوی ہوں''۔

''او اچھا''! ماہی کے منہ سے بے ساختہ یہ ادھورا جملہ ادا ہوا۔

مگر وہ تھوڑی سی حیران ضرور تھی جبھی پوچھ بیٹھی۔۔۔

''آپ کا یہاں آنے کا مقصد؟'' اور اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ کر جواب طلب نظروں سے ریشم کو دیکھنے لگی۔

''میرا شوہر تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تم اُسے بھا گئی ہو کیا تم بھی ایسا ہی چاہتی ہو یا وہ تم سے کوئی زبردستی کر رہا ہے؟''

ابھی ماہی خاموش ہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس سوال کا کیا جواب دے کہ ریشم نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔۔

''جو بھی ہے مگر تم ایسا مت کرنا دیکھو ہمارے بچے ہیں اور سائیں میری پوری دنیا۔ میرا گھر برباد مت کرو۔ تم ابھی کنواری ہو خوبصورت بھی ہو اور پڑھی لکھی بھی ہو تمہیں بہت سے اچھے رشتے مل جائیں گے حویلی کے خواب دیکھنا چھوڑ دو، یہ وڈیرے وہ سمندر ہیں جن کا کوئی ساحل نہیں، نہ معلوم کب کوئی چہرہ سائیں کے دل کو بھا جائے اور لاڈلہ اس کی خواہش کر بیٹھے۔ تم اپنی زندگی کے لیے کوئی اور اچھا سا جیون ساتھی ڈھونڈ لو۔ اس سلسلہ میں، میں بہت کچھ کر سکتی ہوں تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گی''۔

ماہی نے بہت تحمل سے سب سنا اور ریشم کی بات پوری ہونے کے بعد کہا۔

''بہتر ہوتا اگر آپ یہ سب اپنے شوہر سے کہتیں مجھ پر آپ کا کوئی حق نہیں کہ مجھ سے اس طرح بات کریں اور میں اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتی''۔

''اب یہ صرف تمہارے ذاتی معاملات نہیں رہے، جنھیں تم ذاتی کہہ رہی ہو تمہارے یہ

معاملات میری گرہستی کی بنیادیں ہلا رہے ہیں، تم اِن وڈیروں، زمینداروں کو نہیں جانتی مت کرو ایسا تمہیں خدا کا واسطہ۔ دیکھو اِن حویلیوں میں عورت کے جینے کی عمر بہت کم ہوتی ہے ہاں زندہ لاشیں تمہیں بے شمار مل جائیں گی۔ اپنے اُوپر رحم کرو اور مجھے بھی جینے دو۔ تم ایک عورت ہو، عورت کے درد کو سمجھو خدارا ایسا ظلم مت کرو"۔ یہ کہتے ہوئے ریشم نے ماہی کے سامنے ہاتھ تک جوڑ دیے۔

ماہی تذبذب کا شکار تھی کہ اُس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی جو پہلے دروازے کے باہر کھڑی اِن کی تمام باتیں سن رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ ماہی، ریشم کی باتوں کا کچھ اثر لیتی وہ برہم انداز میں بولی!

"دیکھیے خاتون میں ماہی کی ماں ہوں اور آپ سے بہتر اُس کا اچھا برا جانتی ہوں آپ برائے مہربانی ہماری ذاتی زندگی میں دخل اندازی مت کریں اور یہاں سے تشریف لے جایئے آئندہ یہاں آنے کی زحمت مت کیجیے گا"۔ یہ کہتے کہتے اس نے بیرونی دروازے کی طرف ہاتھ سے اشارہ بھی کر دیا۔

ریشم نے ابھی کچھ کہنے کے کو منہ کھولا ہی تھا کہ ماہی کی ماں نے بگڑتے تیور سے کہا۔

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی آپ کو جو بھی کہنا ہے اپنے گھر جا کر اپنے شوہر سے کہیے"۔

پھر ماہی کو دیکھ کر بولی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو"۔

ریشم کے لیے اب وہاں رُکنا ناممکن ہو گیا تھا وہ خاموشی سے وہاں سے واپس آ گئی، اور پھر یہی خاموشی کی چادر اُس نے اُڑلی، راول سائیں اپنی دنیا میں اتنا مگن تھا کہ اُسے ریشم کا خاموش رہنا محسوس ہی نہ ہوا مگر وقت دبے پاؤں گزرنے لگا۔

اس گزرتے وقت کے بدلاؤ نے ریشم کی دنیا ہی بدل کہ رکھ دی۔ اُس کی نظروں کے سامنے ہی حویلی کے دو حصے کر دیئے گئے اور راول سائیں بہت چاؤ سے ماہی کو بیاہ کر اس دوسرے حصے میں لے آئے۔

ریشم نے اماں کی بات مان لی تھی اپنے بچوں کے مستقبل کے لئے سمجھوتے کی چادر بھی اُڑلی۔ مگر وہ چاہ کر بھی اپنے اندر کی عورت کو نہ مار سکی دن بھر تو وہ ممتا سے ہمت مستار لیے رہتی مگر رات میں نجانے کیسے ممتا کہیں سو جاتی اور اس کے اندر کی عورت بغاوت کرنے لگتی ریشم کے کمرے

کی کھڑکی سے حویلی کے دوسرے حصے میں واقع راول اور ماہی کے بیڈروم کی کھڑکی نظر آتی تھی اور یہی کھڑکی ریشم کو ایک اَن دیکھی آگ میں جلائے رکھتی۔ کھڑکی پر پڑے دبیز پردے اندر کا کوئی منظر تو نہ دیکھا پاتے مگر اِدھر اُدھر کی جھریوں سے یہ خبر ضرور دیتے کہ چراغ کب بجھا اور اندھیرا کب روشن ہوا۔ روشنی اور اندھیرے کا یہ کھیل اُسے نفرت اور حسرت کی آگ میں جلانے لگا ،نفرت کے اس زہر نے اُسے اندر باہر سے نیلا کر دیا تھا۔لیکن اُس کی بے بسی اُسے خاموش رکھے ہوئی تھی۔

راول سائیں ریشم اور بچوں کی کسی بھی ذمہ داری سے غافل نہیں تھا لیکن حویلی کے اس حصے میں اُس کا دل نہیں لگتا تھا وہ جب بھی اس حصے میں آتا بے چین اور اُدھورا، اُدھورا سا محسوس کرتا ایسے میں وہ بچوں کے ساتھ ہی اپنا زیادہ وقت گذارتا ریشم کو بھی وہ کوئی اجنبی سا شخص نظر آتا۔

اب ریشم نے گاؤں جانا بھی بہت کم کر دیا تھا کہ جب بھی گاؤں جاتی اُسے ہر ایک آنکھ میں ایک کھوج نظر آتی۔ اُسے ایسا لگتا جیسے سب اُس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں ،ترس کھا رہے ہیں کہ یہ وہ عورت ہے جس کے شوہر نے اُس پر دوسری عورت کو ترجیح دی ہے ،شرمندگی کا احساس اُس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لیتا۔ وہ واپس آ کر بھی کئی کئی دن اپنے آپ کو نارمل نہ کر پاتی۔ ان سب سے پریشان ہو کر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ گاؤں ہی نہ جائے۔ مگر جب اماں نے روتے ہوئے اُسے بتایا کہ تیرے بابا کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ تیرے بھائی انہیں شہر کے بڑے ہسپتال لے کر گئے ہیں تو اُس سے رہا نہ گیا وہ بچوں کو لے کر اماں کے پاس دوڑی چلی آئی۔

دوسرے دن وہ بابا سے ملنے اماں کے ساتھ ہی ہسپتال گئی اُس کے بابا انتہائی نگداشت میں تھے بڑے بھائی نے بتایا کہ بابا کے دل کے والو بند ہیں ڈاکٹر نے آپریشن کا کہا ہے کہ سٹنٹ ڈالنے ہونگے۔ آپریشن کا سن کر اماں نے رونا شروع کر دیا، پریشان تو وہ بھی تھی مگر ماں کو تسلی دے رہی تھی کہ فکر نہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا آپ دعا کریں۔ کہ اماں نے اچانک پوچھ لیا

''یہ سٹنٹ کیا ہوتا ہے؟''

ریشم خود بھی اس بارے میں زیادہ نہ جانتی تھی جو کچھ بڑے بھائی نے بتایا تھا وہی اماں کو اپنی سمجھ کے مطابق سمجھانے لگی۔

''اماں جب دل کے راستے چکنائی کی وجہ سے بند ہو جاتے ہیں تو دل کو خون نہیں پہنچ

پاتا تو اِن راستوں کو کھولنے کے لئے نقلی والو ڈالتے ہیں انہیں سٹنٹ کہتے ہیں''۔

''اس کے بعد تیرے بابا ٹھیک ہو جائیں گے؟''

اماں نے اُمید بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں اماں، بابا انشاء اللہ اچھے ہو جائیں گے''۔ ریشم نے بہت پیار سے اماں کو تسلی دی۔

''تو کیا وہ پھر سے دیسی گھی کا پراٹھا بھی کھانے لگیں گے، انہیں میرے ہاتھ کا دیسی گھی کا پراٹھا بہت پسند ہے''۔ اماں کے لہجے میں کتنی حسرت تھی۔۔

''ہاں اماں ہاں! بابا بالکل اچھے ہو جائیں گے''۔ ریشم نے پختہ یقین سے کہا۔

پھر بابا کا آپریشن بھی ہو گیا اور ان کے دل میں سٹنٹ بھی ڈال دیئے گئے۔ ہسپتال سے ڈسچارج ہوتے ہوئے ڈاکٹر نے کچھ ضروری احتیاطیں بھی بتائیں اِن میں چکنائی سے مکمل پرہیز بتایا گویا اماں کے ہاتھ کا دیسی گھی کا پراٹھا منع ہو گیا تھا۔ جس سے اماں خوش نہ ہو سکیں۔

بابا کی طبعت روز بروز بہتری کی طرف تھی جب ذرا بابا کی فکر کم ہوئی تو اُسے خیال آیا کہ اماں کے گھر میں ایک الٹھر سی خوبصورت لڑکی ہے جو بھاگ بھاگ نہ صرف سب کام خوش اسلوبی سے نمٹا دیتی ہے بلکہ وہ جہاں ہوتی ہے وہاں ماحول کو بھی گل وگلزار سا بنا دیتی۔ یہ بابا کے مزارعے کریم داد کی بیٹی نگینہ ہے۔ ہنسنے ہنسانے والی نگینہ سے اُس کے دونوں بیٹے بھی بہت مانوس ہو چکے ہیں کیونکہ جب وہ بابا کی تیمارداری میں مصروف تھی تو نگینہ نے ہی اِن کا خیال رکھا تھا۔

بچے اُس سے اِس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ اب ضد کر رہے تھے کہ سکینہ اُن کے ساتھ ان کے گھر جائے۔ ریشم نے بھی کچھ سوچتے ہوئے اماں سے کہا کہ وہ سکینہ کے ماں باپ سے اجازت لے لیں۔ انہیں بتائیں کہ میرے بچے اس کے بغیر نہیں رہ سکیں گے ویسے بھی میرا گھر بہت سونا سونا ہو گیا ہے سکینہ کے آجانے سے رونق آجائے گی۔

کریم داد کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اُس نے تو خوشی خوشی اجازت دے دی کہ ہم تو پیدا ہی اپنے مالکوں کی خدمت کے لئے ہوتے ہیں یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے۔

گاڑی میں سامان رکھا جا چکا تھا بچے بھی بیٹھ گئے تھے مگر نگینہ ابھی تک گھر سے باہر نہیں آئی تھی وہ نگینہ کو دیکھنے آئی تو دیکھا نگینہ کی ماں اُسے پیار کر رہی ہے اور ساتھ ساتھ نصیحتیں بھی کر رہی ہے کہ اماں بولیں

''سکینہ تو فکر نہ کر نگینہ بچوں کے ساتھ خوش رہے گی سب اس کا خیال رکھیں گے یہ وہاں نوکر کی طرح نہیں بلکہ گھر کے ایک فرد کی طرح رہے گی''، پھر ریشم کو دیکھ کر پوچھ بیٹھیں

''کیوں ریشم میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟''

''ہاں ہاں اماں نگینہ نوکر نہیں ہے بلکہ یہ تو میری۔۔۔۔''

پھر کچھ سوچ کر ریشم خاموش ہوگئی۔

''دیکھ ریشم تیرے بابا سٹنٹ کے بعد بھی میرے ہاتھ کا دیسی گھی کا پراٹھا نہیں کھا سکتے''۔

اماں نے تڑپ کر کہا۔۔۔۔۔

☆☆☆

کڑیاں

ہمارے ہاں کی پچاسی فیصد عورتوں کو یہ گمان رہتا ہے کہ دنیا کا جو سب سے بیوقوفی کی حد تک کا سیدھا آدمی ہے وہ میرے پلے پڑا ہے۔ جسے ہر کوئی بے وقوف بنا جاتا ہے۔

''کیا تم یہ سیب اللہ واسطے لائے ہو یا پیسوں سے خرید کر؟''

نسیمہ نے اپنے شوہر کے سامنے کچھ گلے سڑے سیب ایک پلیٹ میں الگ کر کے دیکھاتے ہوئے کہا!

جاوید کو دکان جانے کی جلدی تھی جبھی وہ خاموشی سے تیار ہوتا رہا۔ وہ کسی قسم کی بحث میں اُلجھ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے آصف صاحب کا فون آیا تھا وہ بس دکان پہنچتے ہی ہونگے۔

جاوید نے نسیمہ کو کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور جلدی جلدی تیار ہوتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اِس ریڑھی والے کو وہ بعد میں دیکھ لے گا۔ مگر کہاں دیکھے گا اب تو اُن کے ٹھکانے بدلنے لگے تھے، آیا دن بلدیہ اُن کو سڑکوں پر ریڑھی لگانے سے منع کرتی اور یہ ریڑھی بھگائے بھگائے کبھی ادھر کبھی اُدھر بھٹکتے رہتے اور پولیس وین اُن کے پیچھے پیچھے اپنی دھاڑی بناتی رہتی۔۔۔۔

جبکہ سیب لیتے ہوئے بھاؤ تاؤ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ صاف صاف پھل اُٹھا کر اُسے تھما بھی رہا تھا مگر اُسی وقت جیب میں رکھے موبائل کی گھنٹی نے اُس کی توجہ کیا ہٹائی ریڑھی والے نے صاف پھلوں کی جگہ گلے سڑے پھل ڈال دیے۔

موبائل کی اسکرین پر آصف صاحب کا نمبر دیکھ کر وہ خوش ہو گیا تھا، آصف صاحب اکثر اُس کے میڈیکل اسٹور پر آتے اور بہت سی ادویات قیمت خرید سے ۵۰ فیصد کم کے نرخ پر

اُسے دے کر چلے جاتے۔

جاوید جب اپنے میڈیکل اسٹور پر پہنچا تو آصف صاحب بھی اپنی موٹر سائیکل پارک کر رہے تھے مگر جاوید کی نظر اُن کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شاپر پر تھی جس میں ادویات تھیں۔ یوں تو دکان میں اُس کی غیر موجودگی میں سیلز میں ارشد کام کرتا تھا مگر جاوید اِس طرح کی 'ڈیل' خود ہی کرتا تھا۔

آصف صاحب ایک اچھی کمپنی میں اسٹور کیپر کی پوسٹ پر ملازم تھے۔اس کمپنی سے دوسری مراعات کے ساتھ ساتھ میڈیکل کی سہولیات بھی میسر تھیں اِسی سہولت سے وہ فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنے والدین کو مریض دیکھا کر اُن کے نام پر اچھی خاصی ادویات حاصل کر لیتے اور پھر میڈیکل اسٹور پر کم قیمت میں بیچ کر روپے کھرے کر لیتے۔ ہر ماہ چار چھ بار کبھی اپنے والد اور کبھی اپنی والدہ کے نام پر حاصل کی گئی ادویات یہاں بیچ جاتے۔ جاوید اُن کو پیسے دیتے ہوئے کچھ نہ سوچتا بلکہ اپنے منافع کی رقم کا حساب لگانے لگتا۔

آصف صاحب کی تنخواہ تو اچھی تھی مگر نجانے اس میں برکت نہ تھی ورنہ بقول اُن کے وہ یہ کام کبھی نہ کرتے اور پھر جب سے انہوں نے اپنے والد کے خریدے ہوئے پلاٹ پر گھر بنانا شروع کیا اخراجات جانے کہاں کہاں سے نکل کر سامنے کھڑے ہو رہے تھے۔ابھی چار دن پہلے ہی ٹھیکیدار نے مزید پیسوں کا مطالبہ کیا تھا جبکہ وہ مقررہ رقم تنخواہ ملتے ہی دے دیتے تھے مگر بیچ میں اچانک وہ کچھ نہ کچھ کہہ کر مزید رقم مانگ ہی لیتا۔اب بھی اُس نے فون کر کے بتایا کہ بجلی کا کنکشن لگوانا ہے۔وہاں کچھ پیسے دینے ہیں چائے پانی کے عوض اِس لیے اُسے مزید کچھ رقم درکار ہے۔وہ آج شام لینے آئے گا۔آصف صاحب نے اس کے لیے پیسے اکٹھے کرنے تھے۔کچھ تو وہ اسٹور کی صفائی کے نام پر صفایا کر چکے تھے اور کچھ ہفتے بھر کی ادویات کا کوٹہ بھی رکھا تھا۔ جسے بیچ کر وہ قطرہ قطرہ جمع کر رہے تھے۔

ٹھیکیدار فیاض نے آصف صاحب کے ہاں سے پیسے لیے تو سوچنے لگا۔ابھی بھی مطلوبہ رقم کم ہی ہے جو اُسے اُس گورنمنٹ آفیسر کو اپنی فائیل کے ساتھ دینی ہے جس سے وہ سڑک بنانے کا سرکاری ٹینڈر حاصل کر سکے۔اب اُس کے قدم سریہ فروخت کے کارخانے کی جانب تھا جہاں وہ اپنے مختلف پروجیکٹ میں استعمال ہونے والا سریہ خریدتا تھا اُس نے اپنی چرب زبانی سے کارخانے دار کو آئندہ بھی اُسی کی برانڈ کے سریے پر کوٹیشن پاس کرانے کے خواب دیکھا کر

اپنے ساتھ ملا لیا اور کم گیج والا سریہ زیادہ گیج والے سریے کے بدلے خرید لیا۔ یوں قیمت کا فرق اسے سرکاری ٹینڈر کی فائل کی منظوری کا خواب دیکھانے لگا۔ اب فیاض ٹھیکیدار خوش تھا اور خیالوں ہی خیالوں میں سڑک کے ٹینڈر سے حاصل ہونے والے منافع کے خواب دیکھنے لگا۔

دیکھو فیاض یہ ٹینڈر تمہیں دیا جاتا ہے مگر یاد رہے سڑک بنانے سے پہلے ایک انسپیکشن کا مرحلہ آئے گا جیسے بہت ایمانداری سے چیک کیا جائے گا کہ سڑک بنانے میں کیسا میٹرل استعمال کیا جارہا ہے کسی قسم کی کوتاہی مت کرنا۔ تمہیں آئندہ ملنے والے ٹینڈر اس کام پر منحصر ہیں کہ تم کتنی ایمانداری سے یہ کام کرتے ہو۔

فیاض فرمابرداری میں گردن ہلا رہا تھا اور ضمیر صاحب مطمئن نظر آنے لگے کہ انھوں رشوت تو کم لی مگر ایک صحیح انسان کا انتخاب کیا ہے۔ اس طرح وہ نہ صرف ایک اچھی کارکردگی دیکھانے میں کامیاب رہیں گے بلکہ اس سے ملنے والے یقین کی بدولت وہ آئندہ دیئے جانے ٹینڈر اپنے من پسند ٹھیکیداروں کو دینے میں کامیاب ہو جائیں گے اس طرح وہ مالی حدف بھی پا لیں گے یہ سڑک تو ایک وزیر کی چینی کی فیکٹری کو شہر سے ملاتی ہے جہاں اچھی سڑک کی بدولت اس فیکٹری مالک سے تعلقات اس حد تک استوار کرلیں گے کہ بات حصہ داری تک پہنچ جائے۔ اپنے حدف کو پانے کے لیے ضمیر صاحب نے اپنے گریڈ کا بھی استعمال کیا۔ اختیار اور پیسے کی بدولت جب ضمیر صاحب نے شراکت داری کے معائدے پر دستخط کر کے مبارک باد دی تو چینی کی فیکٹری کے مالک کو اپنی فیکٹری کے لیے سال بھر کے خام مال کی دستیابی کے لئے مطلوبہ رقم ضمیر صاحب کے نام ملنے والے بینک قرضے کی صورت میں نظر آنے لگی۔

اب وزیر اپنی فیکٹری کے لئے سال بھر کا نا صرف خام مال خرید کر اپنے گودام بھر سکتا ہے بلکہ اس سے وہ سال بھر چینی کی فراہمی کو کاغذی طور پر مستحکم قیمت پر مہیا کرنے کا ایگریمنٹ کر کے اتنی اچھی کارکردگی کی بنیاد پر دوسری شوگر مل کے لئے بینک میں قرضے کی درخواست بھی دے سکتا ہے۔

دوسری شوگر میل کے لیے بنیک سے قرضے کی منظوری حاصل کرنے کے لیے آئندہ ہونے والے الیکشن میں اشتہاری مہم کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی اس ذمہ داری کی قبولیت سے نہ صرف قومی بینک سے آسان شرائط پر قرضہ مل گیا بلکہ پچھلہ قرضہ معاف بھی کر دیا گیا۔

اور وزیراعظم اب یہ سوچ کر مطمئن ہے کہ ان پانچ سالوں کے بعد اگر آئندہ پانچ سال بھی کرسی مل گئی تو اسی کرسی کی بدولت اپنے اور اپنے پورے خاندان کے لیے دنیا کہ کسی نہ کسی ترقی یافتہ ملک میں زندگی بھر کی سہولیات اور آسائش خرید لوں گا۔ یہ ملک تو ویسے بھی اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس کی حفاظت تو اللہ کرے گا۔

☆☆☆

محبوبہ

وہ مایوں بیٹھی تھی۔ جب نانی اس کے پاس آ بیٹھیں اور اُسے سمجھانے لگیں۔
دیکھو بٹیا! دو دن بعد تمہاری رخصتی ہے، نئے رشتوں میں بندھ جاؤ گی۔ ہم سب کے لئے ایک دم پرائی ہو جاؤ گی، نئے ماں باپ، نئے بھائی بہن، بہت سے دوسرے رشتے اور سب سے بڑھ کر ایک پیار کرنے والا زندگی بھر کا ساتھی۔ سب کے ساتھ اچھے سے رہنا، کسی کی بات بُری بھی لگے تو صبر سے سہہ جانا اور ہاں اپنے شوہر کو بہت پیار دینا اتنا کہ اسے صرف تم ہی تم نظر آؤ۔
وہ پیلے جوڑے میں خود بھی تو سرسوں کا پھول ہی لگ رہی تھی۔ نانی کی باتیں سن کر چہرے پر شرم کی لالی آنے لگی اور اُس نے سر جھکا دیا۔
نانی مسکرا دیں انہیں شرمائی لجائی سویرا پر بہت پیار آنے لگا۔ جبھی تو مسکراتی ہوئی بولیں! میری باتیں سمجھ آ رہیں ہیں ناں! دیکھو بٹیا میری باتیں اپنی گرہ سے باندھ لو تم اپنے شوہر کو جتنی محبت دو گی تمہارے رشتے کی گانٹھ اتنی ہی مضبوط ہوتی جائے گی۔
جی نانی۔
اس نے صرف اتنا ہی کہا۔
'شاباش میری اچھی بٹی' نانی محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کچھ توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئیں۔
''میاں بیوی کا رشتہ نکاح کی برکت اور آپس کی محبت و اعتبار سے پروان چڑھتا ہے لیکن اس میں عورت کو زیادہ حصہ ڈالنا پڑتا ہے۔ اللہ نے عورت کو صبر کی مٹی سے گوندکر بنایا ہے۔ آدمی کا کیا ہے؟ اسے تو چلتی ہواؤں میں بھی سرگوشیاں سنائیں دیتیں ہیں اور سایوں میں بھی

پر چھائیں نظر آتیں ہیں ۔ وہ ان سر گوشیوں سے بھی اقرار کرنے لگتا ہے اور ان پر چھائیوں کی طرف بھی لپکتا ہے۔لیکن سکون کے لئے اُسے صرف گھر اور گھر والی ہی یاد آتی ہے اس لئے تم ایسی گھر والی بننا کہ وہ نہ تو ان سر گوشیوں پر کان دھرے اور نہ ہی پر چھایوں کی تصویریں بنا پائے۔

تو نانی مجھے کیا کرنا ہوگا؟ سویرا نے تذبذب سے پوچھا۔

بٹیا تمیں اپنے شوہر کی داسی بننا ہوگا۔تمیں اپنے جیون ساتھی کے لئے کئی روپ بدلنے ہوں گے۔نانی نے سمجھانے والے انداز میں کہا!

کئی روپ مطلب؟

مطلب یہ کہ صبح سویرے اُس کے جاگنے سے پہلے جاگ جانا اور اُسے آفس جانے کی تیاری میں مدد کرنا پیار سے مسکرا کر ناشتہ کروانا، بالکل ایک ماں کی طرح پھر دن میں ایک آدھ بار اُسے آفس فون کر کے خیریت پوچھنا ایک دوست کی طرح اور شام جب وہ گھر واپس آئے تو ایک وفا شعار بیوی کی طرح سج سنور کر اُس کا انتظار کرنا اور رات میں اُس کی دل داری کرنا ایک داشتہ کی طرح۔۔۔

الفاظ ابھی نانی کے منہ میں ہی تھے کہ سویرا نے تڑپ کر اپنی نانی ماں کو دیکھا جو اپنی زندگی بھر کے نچوڑ کا سبق اُس کے پلو کے کونے میں باندھ رہیں تھیں۔

''باقی سب تو ٹھیک ہے مگر نانی یہ آخری کردار تو بہت برا ہے۔میں کیسے۔۔۔'' کچھ سوچ کر اُسے جھرجھری آگئی یہ تو ایک گالی ہے وہ حیران و پریشان تھی۔

نانی نے بہت پیار سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا

''دیکھو بٹیا! اپنے شوہر کے لئے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔مرد اپنی بیوی میں سب خوبیاں دیکھنا چاہتا ہے۔اپنی ماں کی طرح نگہداشت کرنے والی، ایک دوست جیسی ساتھی، باوفا بیوی جیسی مخلص اور، اور ایک داشتہ جیسی ناز انداز اور دل داریاں کرنے والی مگر صرف بستر میں''۔

سویرا منہ کھولے ہونقوں کی طرح حیرانی سے یہ سب سن رہی تھی کہ اچانک پوچھ بیٹھی

''نانی ماں مرد خود کیا ہوتا ہے؟''

''بٹیا مرد اپنی بیوی کے لئے سب کچھ ہوتا ہے وہ اُس کا آسمان اُس کی زمین ہے اور یہ سب اُس کا حق ہے۔اُس کے حق میں کبھی اپنا حصہ نہ مانگنا وہ دے نہیں پائے گا بلکہ تمہیں ہی قصوروار گردانے گا۔پھر زمانہ بھی اُسی کا ساتھ دے گا۔بس تم اُسے بہت محبت دینا اور اُسکی ہر غلطی

محبت کے کھاتے میں ڈال دینا۔تم دیکھنا وہ صرف تمہارا ہی رہے گا۔تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گا"۔

سویرا کو کچھ سمجھ آیا اور کچھ نہیں لیکن اُس نے نانی ماں کی ساری باتیں اپنے ذہن کی زمین میں بو دیں۔اور شادی کے بعد نانی کی بتائی ہوئی شریک حیات بن گئی۔صبح سویرے اُٹھ جاتی، بہت چاؤ سے ناشتہ بناتی، جمال کو آفس بھیجتی، اس کے بعد گھر کو صاف کرتی، سنوارتی، جمال کے کپڑے دھوتی، دن میں آفس فون بھی کر لیتی، شام کی چائے جمال کے ساتھ ہی پیتی، ہلکی پھلکی گفتگو کرتی، دن بھر کی روداد پوچھتی اور تو اور رات کھانے کے بعد وہ نانی ماں کی بنائی ہوئی عورت بھی بن جاتی۔

شروع شروع میں تو سب ٹھیک رہا پھر بلال کی پیدائش کے بعد بھی کافی حد تک ایسا ہی رہا۔مگر سمیرا کی پیدائش کے بعد اُسے جمال میں تبدیلی کا احساس ہونے لگا۔اب جمال اُس سے بہت کم بات کرتا وہ خود سے بات کرتی تو ہاں ہوں میں جواب دے دیتا، لیکن وہ گرم جوشی اور بے تابی کا اظہار نہ کرتا۔سویرا نے پوچھنا چاہا تو اُس نے ٹال دیا۔

اب تو وہ گھر بھی دیر سے آنے لگا تھا۔سویرا کی شامیں اداس اور خالی پن سے بھرنے لگیں۔مگر وہ کہتی بھی تو کس سے کہتی۔خود ہی اپنے آپ کا احتساب کرنے لگتی کہیں مجھ سے تو کوئی بھول نہیں ہو گئی۔نانی ماں کی باتیں اُسے خوب یاد تھیں اور اس کی زندگی کا چلن انہی پر گزر رہا تھا۔پھر ایک دن جمال نے اُسے خود ہی بتا دیا کہ اُسے رخسار سے محبت ہو گئی ہے اب وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا سویرا جیسے سن ہو کر رہ گئی۔

"مگر جمال میری محبت نے تمہاری ذات کا کون سا کونا خالی چھوڑ دیا جہاں رخسار نے اپنا ڈیرا جما لیا"

سویرا نے بے بسی سے جمال سے سوال کیا۔

"تم بہت اچھی ہو ایک مکمل عورت ایک خیال رکھنے والی بیوی اور بہت اچھی ماں مگر تم محبت سے نا آشنا ہو۔مجھے محبت ہو گئی ہے۔رخسار سے، وہ محبت جو میں نے کبھی تمہارے لیے محسوس نہیں کی۔تمہیں پتہ ہے اُس کی محبت میں اک تشنگی کا احساس ہمیشہ رہتا ہے۔جو مجھے اور بھی اُس کے قریب لے جاتا ہے۔تمہاری محبت کسی ندی کی طرح پرسکون ہے جو رشتوں کی ہواؤں کے زور سے بہتی جاتی ہے۔مگر رخسار کی محبت اُس رنگین شعلے کی مانند ہے۔جس کی دلفریبی اُسے چھونے پر اُکساتی ہے مگر تپش ہاتھ کھینچ لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔عجب مزہ ہے اِس کھیل میں اور دل ہے کہ بھرتا

ہی نہیں جبکہ تمہاری محبت تو مفتوح ندی جیسی ہے جو یک لخت سراب کر دیتی ہے، پیاس بجھا دیتی ہے۔"

جمال کی آواز اُسے دور سے آتی محسوس ہوئی۔

سویرا اپنے اندر ہی سمٹ کر رہ گئی کہ آج وہ سمجھ چکی تھی شوہر سے محبت ضرور کرو مگر اِسے محبت کے جام بھر بھر کے مت دینا۔ اُسے سراب مت ہونے دینا اُس کی تشنگی برقرار رکھنا یہ مرد بہت بے وفا ہے۔ اگر یہ تمہاری محبت کی شراب سے سراب ہو گیا، تو کسی دوسری شراب کا مزہ چھکنے چل دے گا۔ نکاح کے بعد بیوی کے رشتے کو بھی محبوبہ کی چادر میں لپٹے رکھنا۔

کاش نانی نے اُسے بھی محبوبہ بننے کا سبق دیا ہوتا۔

☆☆☆

تبدیلی

دیکھ رمدے مجھے تیرے ساتھ قید کاٹنے اور بھٹے پر کام کرنے میں کوئی اعترض نہیں مگر پھر تجھے بھی میرے ساتھ ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ ہم قید کے دوران کوئی بچہ نہیں پیدا کریں گے۔ میں تنگی تو کاٹ سکتی ہوں مگر اپنے بچے کو پیدائشی غلام نہیں بنا سکتی۔

زیبو نے بڑی حسرت سے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے التجا کی۔

نام تو اُس کا رحیم داد تھا مگر گاؤں کے سب لوگ اُس رمدہ ہی پکارتے تھے ماں جب تک زندہ تھی اُسے اُس کے پورے نام رحیم داد ہی کہہ کر بلاتی تھی پھر ماں کے گزر جانے کے بعد وہ بھی بھول گیا کہ وہ کبھی رحیم داد تھا اب تو وہ رمدہ تھا بس۔۔

''تو سمجھنے کی کوشش کر اگر ہم ساتھ ہونگے تو جلدی اِس قید سے رہائی پالیں گے۔ ورنہ مجھے تیری اور تجھے میری فکر ہوگی۔ دونوں ساتھ ہونگے تو ایک دوسرے کا ساتھ ہماری طاقت بن جائے گا۔ پھر ہم دونوں کا خرچہ دوا، دارو سب مالکوں کے ذمہ ہوگی آخر تجھے سمجھ کیوں نہیں آ رہا''۔

''مجھے سب سمجھ آ رہا ہے فکر کی تو غریب کو گھٹی پلائی جاتی ہے اور تو کس طاقت کی باتیں کر رہا ہے۔ بھلا دو کمزور مل کر کیا پہاڑ کھود لیں گے۔ رہنے دے یہ باتیں، بس میں اپنا بچہ ان ظالموں کے حوالے نہیں کر سکتی، پانچ سال بہت ہوتے ہیں اگر تو مجھے یقین دلا دے کہ اِن پانچ سالوں میں ہمارے ہاں بچہ نہیں ہوگا تو میں تیرے ساتھ رہنے کو تیار ہوں ورنہ نہیں''۔

زیبو نے رمدے کی بات بیچ سے اُچک لی۔

اس سے پہلے کہ رحیم داد کچھ کہتا زیبو دوبارہ بولی۔

تجھے یاد نہیں انور اور اسکی بیوی اِسی اینٹوں کے بھٹے پر قید کاٹ کر جا رہے تھے تو ان ظالموں نے انکے دونوں لڑکوں کو اپنا کہہ کر روک لیا کہ یہ دوران قید پیدا ہوئے ہیں کہ اُس وقت تم لوگ ہمارا دیا ہوا اناج کھا رہے تھے ہماری ہی جگہ پر رہ رہے تھے جب سب ہمارا تو یہ بھی ہمارے ہوئے۔

رحیم داد کو انور کا سارا قصہ یاد آ گیا کہ جب پنچائیت نے انور اور اس کی بیوی کو قید با مشقت کی سزا سنائی تو اس وقت ان کی بیٹی دو سال کی تھی اور انور کی بیوی پیٹ سے بھی تھی۔ جبکہ تیسرا بچہ قید کے دوران ہی پیدا ہوا تھا پانچ سال قید با مشقت کاٹنے کے بعد جب یہ لوگ رہا ہو رہے تھے تو ان کی بیٹی سات سال کی ایک بیٹا چار سال اور دوسرا تین سال کا تھا۔

مالکوں نے انہیں رہائی کہ وقت یہ مژدہ سنایا کہ وہ اپنے دونوں بیٹے چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ قید کے دوران پیدا ہوئے ہیں اس لیے اُن کے حق دار بھٹے کے مالک ہیں۔ جس نے بھی سنا اُس نے اِسے ظلم ہی گردانا مگر ظالم کے حساب کتاب میں یہ صحیح تھا۔

انور نے پنچائیت کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر پنچائیت نے عجیب انصاف کیا کہ وہ اگلے پانچ سال کام کر کے ایک بیٹا اور اُس سے اگلے پانچ سال کام کر کے دوسرا بیٹا بھی لے جا سکتے ہیں ممتا کی ماری انور کی بیوی کسی طور بچوں کو چھوڑنے کو راضی نہ ہوئی تو اُنہوں نے اِس فیصلے کو مقدر مان لیا۔

نا اُمیدی کا دیمک اِنہیں اندر ہی اندر چاٹنے لگا اور اِس خالی جگہ کو بیماری پُر کرنے لگی۔ وہ غریب کام کرتے رہے۔ اِس سے پہلے کہ مدت پوری ہوتی انور کی بیوی زندگی کی بازی ہار گئی۔ اور پھر انور بھی اُس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

انور کے دونوں بچے اینٹوں کے بھٹے پر کام کرتے رہے جبکہ انور کی بیٹی کو حویلی کے کام کاج سونپ دیے گئے پھر ایک دن انہیں اطلاع دی گئی کہ اُن کی بہن کا نکاح کر کے رخصت کر دیا گیا ہے۔ اُن کی بہن کا رشتہ کہاں ہوا کس کے ساتھ رخصت کیا یہ بتانا ضروری نہ سمجھا گیا اگر کچھ ضروری سمجھا گیا تو وہ بہن کی شادی کے اخراجات کا تخمینہ اِن کی قید کے سالوں میں جوڑ دیا گیا۔

غلام ابنِ غلام کے پاس سوال کا کوئی حق نہ تھا۔

رحیم داد نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا

''دیکھ زیبو وہ زمانہ اور تھا اب وقت بہت بدل گیا ہے۔ پھر میری غلطی اتنی بڑی بھی نہیں کہ مجھے سالوں کی قید ہو بلکہ اِس سب میں میرا تو کوئی قصور بھی نہیں''۔

غریب کا وقت اس وقت تک نہیں بدل سکتا جب تک وہ غریب ہے۔ یہ زمیندار انہیں تو ہمارا سانس لینا اور جینا بھی ہمارا قصور نظر آتا ہے۔ زمینوں کے مالک ہیں یہ اور تو کون؟ ان کی زمین پر پانی دینے کی دھاڑی کرنے والا ایک معمولی کمی ہماری کیا اوقات ہے۔ اُن کے سامنے ہم تو اگر ان کی جھوٹی بات کو جھوٹ بھی کہہ دیں تو یہ ہمارا جرم بن جائے تجھ سے تو اِن کی گاڑی کا نقصان ہوا ہے۔ نا جانے کتنی لاگت آئے گی''۔ زیبو نے فکرمندی سے سوچتے ہوئے کہا۔

کلف لگے سفید کپڑوں میں ملبوس گاؤں کے پانچ معتبر ترین لوگ اپنے سروں پر پگڑیاں جمائے حقے کی نہہ گڑ گڑاتے اپنی پوری شان وشوکت غرور وتمکنت کے ساتھ بڑے بڑے سرخ پایوں والی چارپائیوں پر براجمان تھے۔ اِن کے سامنے گاؤں کے لوگ اپنی ٹوٹی پھوٹی چپلیں اُتارے، اپنے ہاتھ جوڑے اپنی اپنی چپلوں کے سامنے اُکڑوں بیٹھے تھے جن کی گردنیں اور نگاہیں جھکی ہوئیں تھی اور اُن کی زبانیں ان کے اپنے ہی دانتوں تلے دبی تھی۔ ایک طرف رحیمداد اور زیبو بھی پریشان فکرمند کھڑے تھے۔

سب کی موجودگی کے بعد بڑے زمیندار نے گاؤں کے لوگوں کو مخاطب کیا اور کہا پچھلے برس ہمارے معتبر پنچوں میں سے ایک پنچ کے جنت سدھار جانے کے بعد اُن کے خاندان کے چشم وچراغ اپنے گاؤں والوں کی محبت میں ولایت سے یہاں واپس آ گئے ہیں اور اب ہماری پنچایئت کا حصہ ہیں اُن کی زندگی کا بڑا حصہ ولایت میں گزرا یہ وہاں ایک بڑے وکیل تھے یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ تمام گاؤں والے یہ جان لیں کہ ہماری پنچایئت کے سب فیصلے پڑھے لکھے سمجھدار اور منصف پنچ ہی کرتے ہیں کسی کو کوئی شک نہیں رہنا چاہیے۔ انصاف کے سب تقاضے پورے ہوتے ہیں۔

گاؤں کے لوگوں کے سر اور زیادہ جھک گئے۔ مگر رحیم داد کی اُمید بڑھنے لگی وہ زیبو کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی دینے لگا۔ بڑے زمیندار نے منشی سے کہا کہ ایک بار سب کی موجودگی

میں رحیم داد پر لگا الزام سنایا جائے رحیم داد اپنا مکمل نام سن کو چونک گیا اور زیبو کی طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو دیکھ میں نہ کہتا تھا کہ اب وقت بدل گیا ہے تبدیلی آ گئی ہے۔

منشی نے کہنا شروع کیا کہ

''رمدہ چودھریوں کی زمینوں کو پانی دے رہا تھا کہ ایک بیل ان کے کھیتوں میں گھس آیا جیسے رمدے نے ہنکا دیا اتھرا بیل دوسری جانب بھاگ گیا اُس طرف سے چھوٹے چودھری اپنی نئی بدیسی گاڑی میں جا رہے تھے جو انھوں نے پچھلے ہفتے ہی خریدی تھی بیل اُن کی گاڑی سے ٹکرایا تو چھوٹے چودھری گاڑی پر اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے اُن کی گاڑی ایک درخت سے جا ٹکرائی جس سے چھوٹے چودھری کی جان تو بچ گئی مگر گاڑی کو بہت نقصان پہنچا۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ پنچائیت رمدے کو پابند کرے کہ وہ اِس نقصان کی تلافی کرے۔ رمدے کے پاس چونکہ اِس نقصان کی بھرپائی کرنا ناممکن ہے اس لئے وہ یہ ہرجانہ چودھریوں کے اینٹوں کے بھٹے پر کام کر کے پورا کر سکتا ہے اس مدت کا تعین بھی پنچائیت کے فیصلے پر منحصر ہے۔''

گاڑی کے نقصان کا تخمینہ لگایا جا چکا تھا جس کے حساب سے رمدے کو سات سال چودھریوں کے اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنا ہوگا اور اگر اس کی بیوی بھی ساتھ کام کرے گی تو یہ مدت گھٹا کر پانچ سال کر دی جائے گی۔ سب نے یہ فیصلہ سنا اب سب رمدے اور زیبو کو دیکھ رہے تھے کہ وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ رمدے کی بیچارگی زیبو کے دل کو پگھلا گئی اور اُس نے اپنے شوہر کے ساتھ بھٹے پر کام کی حامی بھر لی مگر رمدے سے وعدہ بھی لے لیا کہ ہم اپنی نسل کو غلام پیدا نہیں کریں گے مرتا کیا نہ کرتا رمدے نے بھی وعدہ کر لیا۔

زیبو کی ہاں پر رمدے نے پنچائیت کو بتا دیا کہ ہم دونوں میاں بیوی بھٹے پر کام کرنے کو تیار ہیں۔ بڑے زمیندار نے مولوی صاحب کی طرف دیکھ کر پوچھا مولوی صاحب کوئی دینی نقطہ رہ تو نہیں گیا مولوی صاحب نے اپنا گلہ کھنکھارتے ہوئے زمیندار کے اس منصفانہ فیصلے کی تائد کی اور کہا حضور ہمارا دین کہتا ہے کہ جو بھی لین دین کا معاملہ ہوا سے لکھ لیا کرو اگر آپ اسے بھی لکھ کر دونوں کے دستخط لے لیں تو دین کی روح بھی پوری ہو جائے گی۔

ہاں ہاں کیوں نہیں یہ نیک کام آپ ہی کر دیں۔ مولوی صاحب نے ایک کاغذ پر تمام کاروائی لکھ دی اور زمیندار کی طرف بڑھا دیا۔ زمیندار نے پنچوں سے کہا آپ سب دستخط کر دیں تو

رمدہ اور اسکی بیوی بھی انگوٹھا لگا دیں چاروں پنچوں نے باری باری دستخط کر دیے مگر جب ولایتی پنچ کی باری آئی تو پہلے انھوں نے بغور پڑھا اور کچھ سوچنے لگا۔

رحمدے کی اُمید پھڑ پھڑانے لگی اور تبدیلی کا خواب تعبیر کے در پر دستک دینے لگا۔

اور پھر تبدیلی کی گئی۔

ولایت پلٹ پنچ نے دستاویز پر لکھی تاریخ یکم مئی کاٹ کر ۵ بیساکھ لکھ کر دستخط کر دیے۔

☆☆☆

دسمبر کا سندیسہ

پل پل مل کر ساعتیں بنتی ہیں، ساعتیں مل کر سال اور سال کے آخر میں آتا ہے دسمبر!

دسمبر دراصل وصال کا زمانہ ہے، مگر وصال تو ایک پل کی کہانی ہے۔

وہ ایک پل ہی تو ہے۔ جب درخت کی شاخ سے ایک پتہ ٹوٹ کر ہوا کے دوش پر لہرتا ہے اور اُس کے ہجر کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ہوا کے دوش پر اپنے بدن کو ڈولتا چھوڑ دیتا ہے۔

مگر یہ کیا؟

ہوا کچھ دیر اُسے اُڑائے اُڑائے پھرتی ہے اور آخر کار زمین کی گود میں رکھ کر کسی دوسرے پتے کی طرف لپک جاتی ہے۔

وہ پتہ ابھی اپنا تعارف زمین سے کروا ہی رہا ہوتا ہے تو ایک دوسرا پتہ اس کے پہلو میں آ کر گرتا ہے یہ سب دیکھ کر ایک بار پھر وہ کوشش کر کے ہوا کی طرف لپکنا چاہتا ہے مگر زمین پر ہی لڑکھڑا کر رہ جاتا ہے ہوا تو اسے مڑ کر بھی نہیں دیکھتی بلکہ ایک ابدی ہجر اس کا مقدر بنا کر اس کی دسترس سے دور نکل جاتی ہے وہ پتہ دیوانوں کی طرح زمین پر ہی ڈولتا رہتا ہے اور آخر بے بس ہو کر وہیں زمین کی سخت گود میں اپنا مرجھایا ہوا خشک بدن رکھ دیتا ہے۔

اچانک قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ اُس آہٹ میں چاپ سے زیادہ اُسی جیسے دوسرے پتوں کی چیخیں، آہیں اور سسکاریاں ہوتیں ہیں۔ جو قدموں سے لپٹ لپٹ جاتیں ہیں مگر امان تو یہاں بھی نہیں کہ وہ تو یہ سمجھا تھا کہ شاید دونوں کا درد مشترک ہے کہ جس شجر کی ٹھنڈی چھاؤں میں یہ قدم راحت پاتے تھے اب اُس چھاؤں کو نہ پا کر دُکھی ہونگے تو رُک کر اُس سے اُس

چھاؤں کے ہجر کا پُرسہ دیں گے مگر وہ قدم تو اور بھی تیزی سے وہاں سے گذر گئے۔اسی اُجلت میں اپنے قدموں سے لپٹے پتوں کے پُرسے کا بھی جواب نہیں دیا۔

اُف اتنی بے توقیری۔۔

سوکھے پتوں کی چیخیں اور آہیں نوحہ کناں ہوگئیں جن کی خاموش سسکاریاں پوری فضاء میں رچ بس گئیں۔دکھ کچھ اس طرح موسم میں تحلیل ہوا کہ اُداسی ہر سو اپنا ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئی۔

سورج سے یہ سب کہاں دیکھا جا سکا۔اُس نے دھوپ کو بھیجا مگر درختوں سے جدا ہوتے پتوں کا دکھ دھوپ کی آنکھیں بھی دھندلا گیا گو کہ دھوپ نے اپنے آنسو بادل کے آنچل سے پونچھ تو دیے مگر اپنی تب وتاب واپس نہ پا سکی۔سورج سے دھوپ کا یہ بے رونق چہرہ نہ دیکھا جا سکا اسی لیے وہ جلد ہی چھپ گیا۔

ایسے میں چاند خوشی خوشی نکلا مگر فضا کی اُداسی اُس سے چھپی نہ رہ سکی۔اُسے سب سے پہلے اپنی چاندنی کا خیال آیا مگر یہ کیسا موسم ہے جس نے اُس کی چاندنی کو بھی بے وقعت کر دیا ہے اپنے صنم کی بے توقیری چاند کو بھی اُداس کر گئی۔

اِسی اُداسی میں رات کی رانی نے صدائے غم لگائی وہ اپنی خوشبو کے گم ہو جانے پر بین کر رہی تھی۔۔۔۔

کہ دسمبر سے نہ رہا گیا اور وہ چیخ اُٹھا!

میرے سینے پر ہجر وصال کے اتنے سارے بدنما داغ سجا کر کے مجھے تنہائی اور جدائی کا استعارہ بنانے والو ذرا ٹھہر و آ و دیکھو تو۔۔

میں تمہیں بتا رہا ہوں۔

میں تمہیں سیکھا رہا ہوں۔

تمہاری تمام خوشیاں،تمہاری تمام راحتیں،تمہاری تمام لذتیں اپنے ہی جیسے انسانوں سے وابستہ ہیں انسانوں کی بستی میں لوٹ جاو جہاں ماں کی نرم گرم گود بھی ہے،جہاں باپ کی ذات کا تحفظ بھی ہے،جہاں محبوب کی بانہوں کا مضبوط حصار بھی ہے،جہاں محبوبہ کی شکل میں تسکین جسم وجاں بھی ہے۔

یہ خوشگوار فضاء یہ معطر ہوا،یہ چاند کی چاندنی،یہ رات کی رانی نئے سال میں پھر

تمہارے ساتھ ہوگی کہ تم ہی اشراف المخلوقات ہومگر تمہارے رشتے جتنے پرانے ہونگے اُتنے ہی مضبوط اور مربوط ہونگے اپنے رشتوں کو جیواور پل پل ہر پل جیو۔

پھر درختوں سے گرتے پتے نئے گلوں کے کھلنے کا سندیسہ دیں گے

چاند کی چاندنی کو اپنے محبوب کے ساتھ اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھوتو یہ بھی مسکراتی رنگ برساتی دیکھائی دے گی پھر اتنی محبت دیکھ کر رات کی رانی تمہارے آنگن میں کھل اُٹھنے کو بے چین ہوجائے گی۔

تو آؤ !

دسمبر کی دو پہر کی دھوپ میں بیٹھ کر آنے والے خوشگوار موسم کی راہ دیکھیں اور اس انتظار کو مختصر کرنے کے لیے کچھ اپنے دل کی وہ باتیں کرلیں جن میں صرف محبت کی چاشنی اور رسیلے گیت ہیں کہ محبت کی چاشنی اور رسیلے گیتوں کی آس لیے دسمبر کی یہ دھوپ بھی خنک ہوا کی چادر بدن پر لپیٹے آنے والے بہار موسم کے وصل آگیں احساس کو چشمِ تصور میں سموئے اپنے پل پل کو ساعتوں میں تبدیل ہوتے اور ساعتوں کو سال کے قالب ڈھلتے دیکھ رہی ہے

''اور نہ چاہتے ہوئے بھی یہ تماشا دیکھنا ہوگا کہ سنہری تعبیروں والے خوابوں کے عوض ایک مہر ثبت کر کے ہم نے اپنی آنکھیں گروی رکھوادی ہیں۔''

(گروی رکھی آنکھیں)

''جب موت کے رقص کی تھاپ پر سانسوں کی ڈور ٹوٹنے لگتی ہے تو گدھوں کو اپنی زندگی کی نوید سنائی دیتی ہے''۔

(حمام)

''خواہشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ دل کی زمین میں اچانک ہی اُگنے لگتی ہیں کسی خودرَو پودے کی طرح۔ نہ کسی موسم کی محتاج، نہ کھاد، مٹی اور بیج کی، بس چاہ کی نمی اُن کو سیراب کرتی جاتی ہے۔

(عورت اور آئینہ)

''وہ ایک لمحہ تھا جو وقت کی گود سے گرا تھا اور اس کی زندگی میں آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے بچپن میں برف پانی کا کھیل کھیلتے کھیلتے کوئی اسے برف کر گیا اور پھر اُن کا کھیل تو ختم ہو گیا مگر اُس کے ہم جولی اسے پانی کرنا بھول گئے۔ اب وہ وقت کی آنچ سے قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔''

(ٹھنڈا بوسہ)

''شریف آدمی جب برائی کا رستہ اپناتا ہے تو اس کا نقصان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ پھر حرام کی کمائی کسی نشہ کی طرح ہوتی ہے جو عادت بنتی جاتی ہے''۔

(پانچویں بوتل)

خاموشی اور شور جب مل کر اندر ہی اندر دھمال ڈالنے لگتے ہیں تو تخیل کی پتنگ شعور کے آسمان پر اُڑنے لگتی ہے پھر نجانے کب وہ کسی خیال پر پیچ ڈال کر کہانی بن لیتی ہے۔ مجھے لفظوں سے جڑے رہنا اچھا لگتا ہے اور میں ان سے جڑے رہنا چاہتی ہوں۔ یہ کہانیاں یہ افسانے شاہراہِ زیست کے ہر موڑ پر واقعات اور سانحات کی صورت بکھرے ہوئے ہیں میں ان سے نظر بچا کر نہیں گزر سکتی اس لئے ان واقعات اور سانحات میں قید احساسات، محسوسات، جذبات، حسیات اور خیالات کو الفاظ کا پیراہن دے کر سنوارتی سجاتی ہوں۔ مگر الفاظ کے تحیر میں اسیری پا کر ان کا فسوں افسانے کا رنگ اُڑ لیتا ہے۔ کچھ دھڑکتے دلوں کے جذبات، کچھ جیتے جاگتے لوگوں کی زیست کے رنگ اور کچھ سوچتے اذہان کے خیالات ان سے ملنے لگتے ہیں تو ایک دنیا سی بسنے لگتی ہے۔

یہ زندگی جو ایک بار ملتی ہے مگر اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑ دیتی ہے کہ آپ نے اسے کیسے امر کرنا ہے کیا مرتے مرتے جینا ہے یا مر کر بھی زندہ رہنا ہے۔ میری خواہش صرف اتنی سی ہے کہ میں زندگی اور خوشی کو ایک ساتھ جڑا دیکھنا چاہتی ہوں۔ مانا کہ غم نہ ہو تو خوشی نہیں، سکھ کے ساتھ دکھ بھی ہے، وصل کے ساتھ ساتھ ہجر بھی ہے اگر ملن کے خوشگوار گیت ہیں تو فراق کا نغمہ بھی مگر نجانے کیوں یہ سب جانتے ہوئے بھی میری یہی خواہش ہے کہ اگر آنکھ سے آنسو بھی نکلے تو صرف خوشی کا آپ سوچ رہے ہونگے کہ یہ سب یہاں لکھنے کا کیا مصرف تو میں صرف یہی کہوں گی کہ میری تحریر میں ایک دعوت ہے، اُس دوسرے رستے کی کھوج ہی جس کے انجام پر راحت، سکون اور خوشی اپنی بانہیں وا کیے آپ کا انتظار کر رہے ہیں کہ اگر یوں نہ ہوتا تو یوں ہوتا۔

صائمہ نفیس